غوری تحقیقات : اسلام میں علوم عقلیہ — ۱

اسلامی ہند میں علوم عقلیہ

از
شبیر احمد خاں غوری
علیگڑھ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

غوری تحقیقات : اسلام میں علوم عقلیہ — ۱

اسلامی ہند میں علوم عقلیہ

از

شبیر احمد خاں غوری

علیگڑھ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Marfat.com

13/242

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علیگڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

اشاعت: ۱۹۹۷ء
قیمت: ایک سو پچیس (۱۲۵) روپے

پاکیزہ آفسٹ، محمد پور روڈ، شاہ گنج، پٹنہ میں طبع ہوئی

Marfat.com

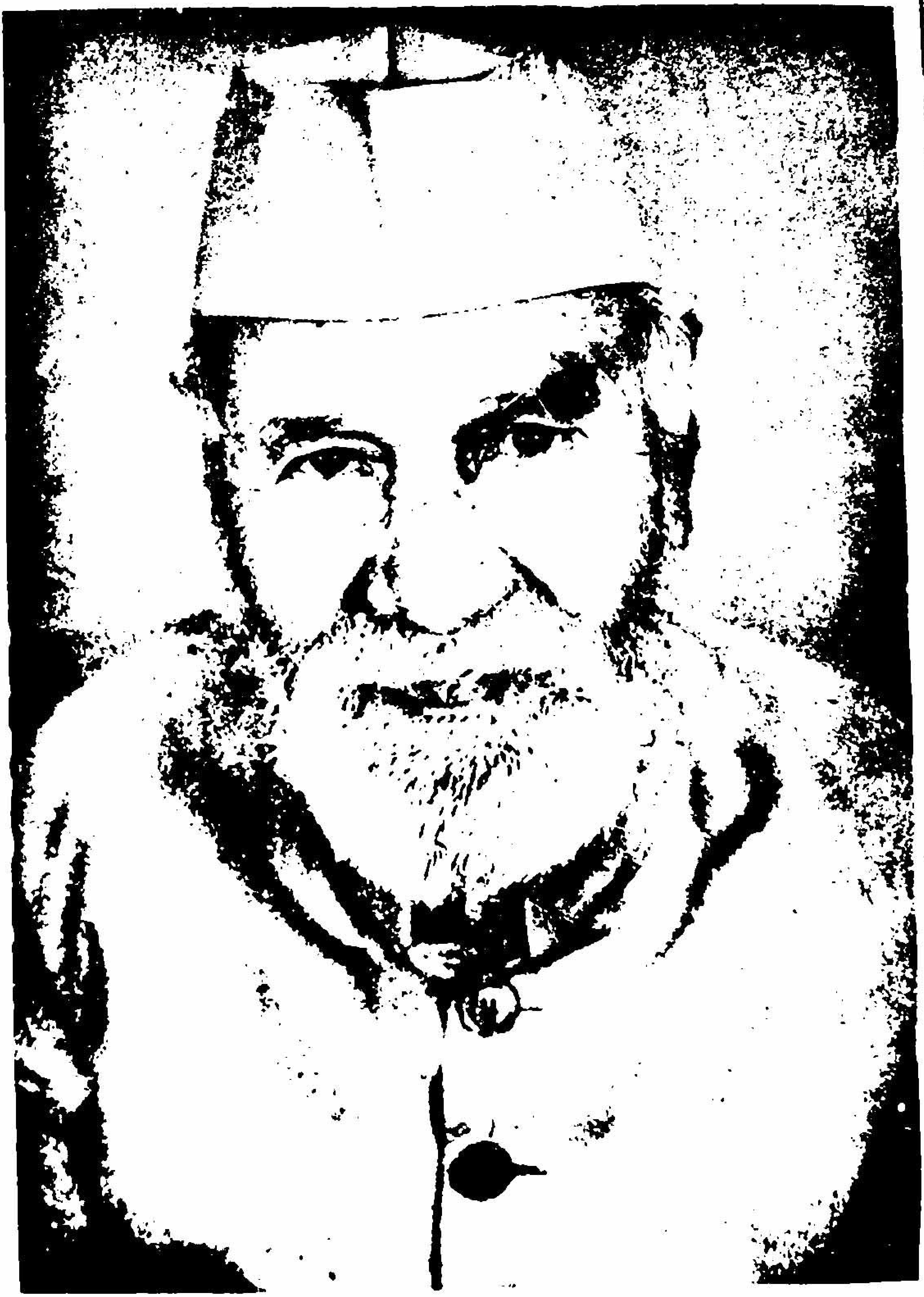

شبیر احمد خاں غوری

Marfat.com

○

شبیر احمد خاں غوری: آپ کے والد کا نام غیاث الدین خاں غوری ہے، ۱۵ مارچ ۱۹۱۱ء کو علیگڑھ میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، اردو، ریاضیات میں ایم اے کیا، اس کے علاوہ ایل ایل بی، منشی کامل اور درس نظامی سے عالم فاضل کیا اور ہر ایک امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء۔ ۱۹۶۶ء انسپکٹر آف اسکول اینڈ رجسٹرار عربک اینڈ پرشین اکزامینیشنز کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۶۶ء۔ ۱۹۷۲ء دہلی یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے آپ نے درس دیا، ۱۹۷۲ء۔ ۱۹۷۷ء اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے لٹریری ریسرچ یونٹ میں سینیر ریسرچ آفیسر کے عہدے پر مامور رہے۔ عربی ادب، اسلامیات، ہیئت، فلسفہ، ریاضیات آپ کے خاص موضوع ہیں۔ ان موضوعات پر تقریباً ایک ہزار خالص تحقیقی مقالات منظر عام پر آچکے ہیں۔

۱۹۹۱ء میں عربی، فارسی کے ممتاز اسکالر کی حیثیت سے آپ نے صدر جمہوریۂ ہند ایوارڈ حاصل کیا۔ ۱۹۹۲ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے فخرالدین علی احمد غالب ایوارڈ سے آپ کو نوازا گیا۔ فی الحال علیگڑھ میں مقیم ہیں۔

★★

Marfat.com

حرف آغاز

شبیر احمد خاں غوری صاحب محتاج تعارف نہیں۔ ان کا شمار نامور فضلاء میں ہوتا ہے۔ اسلامی علوم و فلسفہ ان کا اختصاص ہے۔ انھوں نے بہت لکھا ہے اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس سے ان کی علمیت و بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریر تائید میں ہو یا تردید میں ان کے تبحر علمی کا پتا دیتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ردّ و انکار کا عنصر نمایاں ہے۔ لیکن جب بھی انکے قلم نے اثبات کی وادیوں کا رخ کیا ہے تو اسے دلیل و برہان کے لعل و گہر سے مزین کر دیا ہے اور قارئین کو ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ان کی نگارشات ۱۹۵۶ء تا ۱۹۸۵ء تقریباً تیس سال کی مدت میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہی سوچ کر فیصلہ کیا کہ ان کی منتشر تحریروں کو اگر یکجا کر دیا جائے تو مطالعے میں بہت آسانی ہوگی۔ لہٰذا تلاش و تدوین کا کام شروع ہوا۔ خود فاضل مصنف نے بھی ہماری دستگیری فرمائی۔ ہم نے اپنی بساط بھر کوشش کی کہ ان کی ساری تحریروں کا احاطہ کر لیا جائے۔ اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ہم بہرحال یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کی ہر تحریر ہماری گرفت میں آگئی ہے۔ اگر ہمارے قارئین کو ان کے دیگر مضامین کا علم ہو تو ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں۔

ان کے افکار و آراء کو ہم آٹھ جلدوں میں پیش کر رہے ہیں جن کا مستقل عنوان یا عنوان سلسلہ "غوری تحقیقات: اسلام میں علوم عقلیہ" ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہر جلد کا ایک علیحدہ عنوان بھی ہے۔ جیسے جیسے یہ کتابیں چھپتی جائیں گی، منظر عام پر آتی رہیں گی۔

—— حبیب الرحمٰن چغانی

Marfat.com

فہرست

حرف آغاز

اسلامی ہند کے نصف اوّل میں علوم عقلیہ کا رواج ۱

محمد بن تغلق کی فلسفہ پرستی ۱۰۰

ملک العلماء، شہاب الدین دولت آبادی ۱۰۷

ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے مآخذ ۱۲۷

اسلامی ہندستان کی علمی خودداری الدرۃ الثمینہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ جہاں اور نواب سعداللہ خاں ۱۸۷/۲۴۸

Marfat.com

اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج

جناب مولانا ابو محفوظ الکریم المعصومی (محاضر التاریخ الاسلامی، مدرسہ عالیہ کلکتہ) نے "انڈو ایرانیکا" کی گذشتہ اشاعت میں "صدر الدین الشیرازی حیاتہ وآثارہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس کے اول و آخر میں ملا صدرا کی ہندوستان میں مقبولیت پر زور دیا ہے، آخر مقالہ میں تو "صدرا" (شرح ہدایۃ الحکمۃ از صدر الدین الشیرازی) کے کوئی چوبیس حاشیوں کا ذکر کیا ہے جو علمائے ہند نے اس کتاب پر لکھے ہیں، افتتاحیہ میں فرمایا ہے:-

وصلت كتب العلامة محمد بن ابراهيم	ملا صدرا کی تصنیفات ہندوستان پہنچیں تو
الشهير بملا صدرا الى اقطار الهند	یہاں کے ممتاز علمی حلقوں نے ان کی طرف
فاقبلت عليها الاوساط العلمية	بڑی توجہ کی، ان کی نشر و اشاعت میں اہتمام
بما عكفت على نشرها ودراستها	اور انہیں درس میں شامل کیا، چنانچہ بعض
واحتل بعضها مكانة خاصة	کتابوں کو درس نظامیہ کے نصاب میں
في برنامج الدرس النظامي	بڑی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہو گئی

اور اس مقبولیت کی تمہید میں لکھا ہے:-

ولقد سجلت لنا صفحات التاريخ	صفحات تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں

Marfat.com

قدیم مسلمان ہیئت دانوں کے بنائے ہوئے اس آلہ پر مبنی ہے جو "المساطرہ" کہلاتا تھا، اور جس کا ذکر تفصیلی طور پر آلات رصدیہ پر لکھنے والے مصنفین نے کیا ہے۔ ان میں سے بہت سی کتابیں فرانسیسی مستشرق سدیو کی دسترس میں تھیں اور انہی کی مدد سے اس نے اپنی کتاب ترتیب دی تھی

"Memoire Sur les instruments astronomique des Arabes"[1]

ان کتابوں میں سے بعض راجہ جے سنگھ کے بھی پیش نظر رہی ہیں جن کا زیج محمد شاہی کے دیباچہ میں حوالہ دیا ہے:

"چندے از آلات رصدی کہ آنجا قدیم تر ساختہ بودند از روے کتب اسلامیان دراینجا ہم ساخت"[2]

خوش قسمتی سے ان میں ایک اہم کتاب نظام الدین عبد العلی برجندی کی "رسالہ فی آلات الرصد" ہے۔

دو اور آلے جن کی اختراع کو راجہ جے سنگھ کی عبقریت کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے "رام جنتر" اور "دگامسا جنتر" ہیں، اگرچہ جی۔ آر۔ کائے کا خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے وضع کردہ دائرۃ السموت (Azimuth circle) نیز دائرۃ السموت اور دائرۃ الارتفاع کے مرکب آلہ (Combined Azimuth and Altitude instruments) سے ماخوذ ہیں جنہیں اصل کے مقابلہ میں بہت بڑا اور دھات کے بجائے پتھر سے بنایا گیا ہے[3]

ختم مقال سے پیشتر میں مصنف کے ایک دلچسپ انکشاف کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"سائنس کی تاریخ میں ایک عجیب نکتہ قابل غور ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو براہ راست زاویائی پیمائش سے کتراتے تھے۔ ان کی ریاضیاتی تصانیف میں زاویوں سے متعلق کوئی قاعدہ یا کلیہ اثباتی نہیں ملتی" Indian Mathematics

وہی کہتا ہے: (ص ۲۵۹) ہندوؤں نے زاویہ جیسی مانوس اور بنیادی مقدار کے لئے کا لفظ بیرونی ملک یونان کے Vunia سے حاصل کیا ممکن ہے یہ کوئی عجیب بات نہ معلوم ہو لیکن اس کی تائید میں ہم اس چونکا دینے والی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائیں گے کہ ہندو ریاضیات کے اس ترقی یافتہ اور طلائی دور میں بھی جو مسلم دور سے بعد کی تصنیف کا زمانہ ہے، ہندو ریاضی داں اپنے حسابات میں زاویوں کا کسی طرح بھی استعمال نہیں کرتے

---

[1] زیج محمد شاہی اوراق ۲ الف [2] G.R.Kaye. p. 87 [3] G.R.Kaye. P. 87 footnote (3)

Marfat.com

ان الروابط العلمية بين المملكتين	ملکوں کے درمیان علمی تعلقات ہمیشہ مستحکم رہے
لم تزل متاكدة بتتابع اعلام الحكمة	اور اس کی وجہ مغلیہ دربار سے حکمت اور
والفنون الى البلاط المغولى نعم رحلة	فنون کے ماہرین کی مسلسل وابستگی اور یقیناً بعض شا
بعض المغرمين بالحكمة الى بلاد العجم"	حکمت کا سفر عجم (ایران) بھی،

ہندوستان اور ایران کے درمیان علمی و ثقافتی (اور اسی طرح سیاسی) روابط کا وجود ایک حقیقت ہے، جو بہرحال متحقق ہے، مگر یہ اس قسم کے روابط نہ تھے جس طرح آجکل کے خیرسگالی کے مشن ہر دو ملکوں کے درمیان بنا دیا کرتے ہیں۔ اس قسم کی متکلفانہ "روابط سازی" کا موضوع جب حقیقی روابط علمیہ کو بنایا جاتا ہے تو بات بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے، اور بڑے بڑے مدعیانِ تاریخ دانی بھی اس تکلف میں آکر سطحیت کا شکار ہو جاتے ہیں،

لیکن اگر مخلصانہ طور پر ان روابط علمیہ پر زور دینا تھا تو ان کی تفصیل کو پہلی صدی ہجری سے لے کر بارھویں صدی تک (جو ایک تاریخی حقیقت ہے) بیان کرنا چاہیے تھا، اور اگر اختصار مانع تھا تو کم از کم

(۱) نویں صدی ہجری سے قبل علوم عقلیہ کی اہمیت سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا، اور

(۲) نہ ان ثقافتی روابط کو "بلاط مغول" کی حد بندی سے محدود کرنا تھا،

کیونکہ یہ تو اپنے ہی موقف کی تردید ہے۔ لیکن معصومی صاحب کا فرمانا ہے

ويظهر من تتبع تاريخ الثقافة الاسلامية	ہندوستان کی اسلامی ثقافت کی تاریخ
في الهند ان الفنون العقلية لم تحظ	کے مطالعہ و تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ
ببالغ التقدير في برامج المدارس	نویں صدی ہجری کے آخر تک یہاں کے
السائدة الى نهاية القرن التاسع	مروجہ نظامہائے درس میں علوم عقلیہ
الهجري، وانهم ما تجاوزوا في دراستهم	پوری طرح رائج نہ ہو سکے تھے اور

Marfat.com

طيلة هذه المدة عن الرسالة الشمسية في المنطق وعن بعض الشروح على كتاب الصحائف في الفلسفة والكلام

اس طویل مدت میں منطق میں رسالہ شمسیہ اور فلسفہ وکلام کے بعض شروح جیسے شرح کتاب الصحائف سے ان کے قدم آگے نہیں بڑھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

وفي اواخر القرن التاسع حينما اعتلى السلطان سكندر اللودي (۸۹۴ھ - ۹۲۳ھ) على عرش المملكة تطورت الحركة العلمية بنوع خاص واتسع المجال للعلوم العقلية من ذي قبل ..... ونقل خاصة عن الشيخين عبد الله وعبد العزيز (؟ عزيز الله) التلنبيين انهما وفدا على السلطان فاقبل عليهما بحفاوة بالغة وامدهما بسيبه ونواله حتى تكللت مساعيهما العلمية بنجاح باهر؛ وهما يعتبران بحق صاحبي آيات في نشر الدروس الفلسفة في شمالي الهند.

نویں صدی کے آخر میں جب سکندر لودی (۸۹۴ھ - ۹۲۳ھ) تخت حکومت پر بیٹھا علم وفن میں خاص طرح کی ترقی ہوئی اور پہلے کے مقابلہ میں علوم عقلیہ کا میدان وسیع ہوا ..... شیخ عبداللہ و عبدالعزیز (؟ عزیز اللہ) تلنبی کے متعلق خاص طور سے کہا جاتا ہے، کہ یہ دونوں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا اور انہیں انعامات و تحائف سے نوازا، ان دونوں کی علمی کوششیں بڑی بارآور ہوئیں، اور شمالی ہند میں فلسفہ کی تعلیم کی اشاعت میں وہ نہایت نمایاں اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد مغل عہد کے علمی و ثقافتی تغیرات کے بارے میں فرمایا ہے :-

Marfat.com

تغیرت الظروف السیاسیة فی الهند
واعتلت الاسرة التیموریة
علی عرش المملکة فعندئذٍ دخلت
الفلسفة فی طور جدید من
الازدهار وخاصة بقدوم
السید فتح الله الشیرازی (م ۹۹۷ھ)
من جنوبی الهند سنة ۹۹۱ھ وهو
اول من نشر فی الاصقاع الشمالیة
کتب المتاخرین من علماء ایران

جب ہندوستان کے سیاسی حالات میں تبدیلی
ہوئی اور تیموری خاندان نے تخت حکومت
پر قبضہ کیا تو ۹۹۱ھ میں خصوصاً جنوبی ہند
سے سید فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ)
کی آمد سے فلسفہ نئے دور میں داخل ہوا
اور اس کی مقبولیت میں غیر معمولی ترقی
ہوئی، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے متاخرین
مشاہیر ایران کی کتابوں کو شمالی ہند
میں رائج کیا،

معصومی صاحب کا ماخذ جیسا کہ انھوں نے حاشیہ میں فرمایا ہے، میر غلام علی آزاد کا تذکرہ مآثر الکرام ہے، آزاد نے مولانا عبد اللہ تلنبی کے حال میں لکھا ہے:-

"آخر الامر از خرابی ملتان او و شیخ عزیز اللہ تلنبی رخت رحلت بدار الخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول را دریں دیار مروج ساختند و پیش ازیں غیر شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نبود۔"

اور مآثر الکرام کا ماخذ ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ ہے، بدایونی نے سلطان سکندر کے تذکرہ میں لکھا ہے:-

"و از جملہ علمائے کبار زمان سلطان سکندر شیخ عبد اللہ تلنبی در دہلی و شیخ عزیز اللہ تلنبی در سنبھل بودند، این ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان بہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نبود۔"

Marfat.com

اگر فاضل مقالہ نویس آزاد ہی کے حوالے پر اکتفا فرماتے تو بات گمراہ کن نہ ہوتی، آخر انہوں نے ملا عبدا(لحکیم سیالکوٹی) کی بعض مصنفات کے بارے میں بھی تو "والعہدۃ علی ہذا الکلمات" لکھ کر خود کو بری الذمہ کرلیا ہے۔ مگر خدا جانے یہاں کس خیال کے ماتحت انھوں نے اس بات کے "تاریخ کی حقیقت ثابتہ" ہونے کا ادعا فرمانا مناسب سمجھا کہ

يظهر من تتبع تاريخ الثقافة	ہندوستان کی اسلامی ثقافت کی
الاسلامية في الهند ان الفنون	تاریخ کے مطالعہ و تتبع سے ظاہر
العقلية لم تحظ ببالغ العناية	ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری کے آخر تک
في مناهج الدروس السائدة	یہاں کے مروجہ نظامہائے درس میں علوم عقلیہ
الى نهاية القرن التاسع الهجري	پوری طرح رائج نہ ہو سکے تھے۔

اس قسم کا دعویٰ اگر کسی جدید تعلیم یافتہ کے قلم سے نکلتا تو کچھ مستبعد نہ ہوتا، لیکن قدیم درسگاہوں کے فضلاء جن سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلامی علوم کے تعلق باہمی سے کما حقہ واقف ہونگے اگر اس قسم کا استدلال کریں کہ چونکہ نویں صدی سے پیشتر منطق میں "شمسیہ" (یا شرح شمسیہ یا قطبی) اور کلام میں "شرح الصحائف" سے زیادہ کا رواج نہ تھا، اس لیے قبل مغل اسلامی ہند میں معقولات کا معیار کچھ اونچا نہ تھا، تو بڑا افسوس ہوتا ہے۔

نیز یہ استدلال اور سطحیت اس دیرینہ غلط فہمی کے اشتداد کا موجب ہو سکتے ہیں جو قبل مغل عہد کے ہندوستانی علماء کی مساعی فکریہ کے متعلق مخالفوں کے ذہن میں جاگزیں ہیں کہ

"ان کی سرگرمیاں صرف مذہبی رسوم کی جزئیات کے التزام میں محدود رہیں، انھوں نے علم و حکمت کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔"

اور جس کے ازالے کی طرف ڈاکٹر اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کی توجہ دلائی تھی۔

"دارالمصنفین سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب نکلنی چاہیے، اس امر کی سخت ضرورت ہے، عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔" (مکتوب اقبال بنام سید سلیمان ندویؒ، معارف اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۳۱۴)

اس لیے اس قسم کی گمراہ کن غلط فہمیوں کے ازالے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بہرحال نہ تو

(۱) علوم عقلیہ محض منطق اور کلام میں محدود رہا، جیسا کہ معصومی صاحب نے سمجھا ہے کہ

ان الفنون العقلیة ...... ما تجاوزوا فی دراستهم طیلة هذه المدة عن الرسالة الشمسیة فی المنطق وعن بعض الشروح علی کتاب الصحائف فی الفلسفة والکلام

فنون عقلیہ ...... اس طویل مدت میں منطق میں رسالہ شمسیہ اور فلسفہ و کلام کے بعض شروح جیسے شرح کتاب الصحائف سے لوگوں کے قدم آگے نہیں بڑھے۔

(۲) نہ علمی روابط صرف "بلاط مغولی" ہی کے ساتھ مختص تھے، جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے دعویٰ کیا ہے:

ان الروابط العلمیة بین المملکتین لم تزل متأکدة بتتابع اعلام الحکمة والفنون الی البلاط المغولی

دونوں ملکوں کے درمیان علمی تعلقات ہمیشہ مستحکم رہے اور اس کی وجہ مغلیہ دربار سے حکما اور ماہرین فن کی مسلسل وابستگی تھی۔

(۳) نہ نویں صدی سے پیشتر ہندوستان میں علوم عقلیہ کی وہ کساد بازاری تھی جس کے ثابت کرنے پر معصومی صاحب اس درجہ مصر ہیں۔

Marfat.com

(۱) علوم عقلیہ

اسلامی علوم کی مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں جن کی تفصیل موجب تطویل ہوگی، ویسے عام طور پر انھیں منقول اور معقول میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ منقول میں علوم دینیہ (تفسیر، حدیث، فقہ) اور علوم ادبیہ آتے ہیں، اور معقول میں منطق، فلسفہ، ریاضی وطب وغیرہ، جنھیں مجموعی طور پر "حکمت" کہتے ہیں کبھی کلام کو اور کبھی کبھی اصول فقہ کو بھی معقول ہی میں محسوب کرلیا جاتا ہے، کیونکہ ان دونوں میں بھی محض شواہد شرعیہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا، عقلی دلائل بھی دیے جاتے ہیں۔

فلسفہ یا حکمت کی دو بڑی قسموں میں تقسیم کی جاتی ہے: حکمت نظری اور حکمت عملی۔ اول الذکر کی تین قسمیں ہیں طبیعیات، ریاضیات اور الٰہیات۔ آخر الذکر کی بھی تین قسمیں ہیں: اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن۔

حکمت عملی کی تینوں قسموں کی تعلیم کا کبھی کوئی رواج نہیں رہا، نہ ہندوستان میں اور نہ عراق وایران میں۔ اگرچہ بعض یونانیت پسندوں نے ارسطو کی "کتاب الاخلاق" اور افلاطون کی "کتاب السیاسۃ" (Republic) کے ساتھ ترجمہ وتفسیر کے ذریعے اعتنا کیا، نیز ان کی تقلید میں مستقل تصانیف مرتب کیں، مگر عام علمی حلقوں میں انھیں مقبولیت نصیب نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے "ہدیہ سعیدیہ" میں لکھی ہے:۔

والحکمۃ العملیۃ... وقد اعرض	حکمت عملیہ کی مزاولت سے لوگوں نے
الناس صفحا عن مزاولتها و	صرف نظر اور چند اشخاص کے علاوہ اس کے
اعرضوا الا قلیلا عن محاولتها	حصول سے اعراض کیا، کیونکہ دین حنیف
فان الملۃ الحنیفیۃ البیضاء	اور شریعت مصطفوی نے اس کی ضرورت

Marfat.com

والشريعة المصطفوية الغراء	بدرجۂ کمال پوری کردی اور وحی الٰہی
قد تضمنت الوطر عنها على وجه	نے فکر انسانی کے اعمال سے کہیں زیادہ
هو اتم تفصيلا والوحي الالهي	نفع بخش اور افضل و برتر شے عطا کر کے
الرباني قد اغنى عن اعمال الفكر	اس سے بے نیاز کر دیا۔
الانساني فيها بما هو اكثر نفعا	
واكبر تفضيلا	

طبیعیات کے اصول طب کی کتابوں کے تمہیدی مقدمات میں آتے ہیں اسلیے ان پر واقف ہوئے بغیر طب کے اصول کا سمجھنا ناممکن ہوتا ہے، لہٰذا طب کی تعلیم کے لیے طبیعیات کی تعلیم ضروری ہے؛

ریاضیات کے چار شعبے ہیں: ۔ حساب، ہندسہ، ہیئت اور موسیقی، حساب اور اس کی مختلف شاخوں سے واقفیت دیوانِ کتابت کے کتاب اور دبیروں کے لیے ضروری تھی، اس لیے اس کا رواج ہر زمانہ میں ناگزیر تھا، ہندسہ مساحت کے لیے لابدی ہے، اور مساحت تشخیص خراج کے واسطے ازبس ضروری ہے، بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کی معیشت کا دارومدار زرعی اقتصادیات پر ہے، نیز فن تعمیر میں مہارت کے لیے بھی ہندسہ دانی شرط ہے، اس لیے ہر ترقی یافتہ ملک میں فن تعمیر کے ضمن میں ہندسہ کی ترقی فطری ہے، ہیئت کا جاننا نجوم میں حذاقت کے لیے ازبس ضروری ہے، لہٰذا جہاں نجوم کا چرچا ہوگا (جیسا کہ ہندوستان میں) وہاں لوگ ہیئت سے ضرور واقف ہوں گے۔ رہی موسیقی تو ہر تہذیب میں اس کا مخصوص مقام ہوتا ہے،

الٰہیات کے مسائل کا مسائل کلامیہ سے تصادم ناگزیر ہے۔ اس لیے علم کلام کے افہام و تفہیم کے لیے فلسفہ الٰہیات میں تبحر ضروری ہے، چنانچہ شیوخ معتزلہ نے جو علم کلام کے بانیوں میں تھے، شروع ہی سے خود کو فلسفہ سے آشنا بنانے کی سرگرم کوشش کی، شہرستانی نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے: ۔

ثم طالع بعد ذلك شيوخ المعتزلة كتب الفلاسفة حين فسرت ايام المامون فخلطت مناهجها بمناهج الكلام ...... فكان ابو الهذيل العلاف شيخهم الاكبر وافق الفلاسفة ..... ثم ابراهيم بن سيار النظام في ايام المعتصم كان اعلى في تقرير مذاهب الفلاسفة ..... ثم ظهرت بدع بشر بن المعتمر ...... والميل الى الطبيعيين من الفلاسفة"	اس کے بعد جب مامون کے زمانہ میں فلاسفہ کی کتابوں کی تشریح کی گئی تو شیوخ معتزلہ نے ان کا مطالعہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ کلام کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ...... اور معتزلہ کا سرخیل ابو الہذیل علاف فلاسفہ کا ہم خیال ہو گیا ..... پھر معتصم کے زمانہ میں مذاہب فلاسفہ کے اثبات میں ابراہیم بن سیار نظام سب سے بہتر تھا، ...... پھر بشر بن معتمر نے نئے خیالات ظاہر کیے ..... اور فلاسفہ طبیعیین کی جانب لوگوں کا میلان بڑھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ کلام کے ساتھ خلط ملط ہونا شروع ہو گیا، چنانچہ علامہ تفتازانی نے "شرح عقائد نسفی" میں لکھا ہے :-

لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى العربية وخاض فيها الاسلاميون وحاولوا الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة فخلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفة ليتحققوا مقاصدها فيتمكنوا من ابطالها۔	پھر جب یونانی زبان سے عربی زبان میں فلسفہ منتقل کیا گیا اور علمائے اسلام نے اس کی جانب توجہ کی اور فلاسفہ کی مخالف شریعت باتوں کے رد کا ارادہ کیا تو اس مقصد کے حصول اور فلسفہ کے ابطال کے لیے کلام اور فلسفہ کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا

اور یہ اختلاط متاخرین متکلمین کے یہاں اپنی انتہا کو پہنچ گیا، چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے :۔

ثم توغل المتاخرون من بعدهم	پھر متاخرین کتب فلسفہ کو خلط ملط کرنے
فی مخالطة کتب الفلسفة	میں حد سے زیادہ بڑھ گئے .. اور کلام
والتبست مسائل الکلام بمسائل	و فلسفہ کے مسائل اس قدر گڈ مڈ ہوگئے کہ
الفلسفة بحیث لا یتمیز احد الفنین	ایک فن کا دوسرے سے امتیاز کرنا مشکل
من الآخر۔	ہوگیا ،

پھر بات علم کلام تک ہی محدود نہیں رہی، کلام سے بڑھ کر اصول فقہ تک علوم عقلیہ سے متاثر تھا، کیونکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اصول فقہ کی بنیاد بھی اسی شخص نے ڈالی تھی جو بلاشبہ علم کلام کا بانی سمجھا جاتا ہے یعنی واصل بن عطا ، ابو ہلال العسکری نے اس کے بارے میں لکھا ہے،

وھو اول من قال الحق یعرف من	وہ پہلا شخص ہے جس نے کہا کہ معرفت حق
وجوہ اربعة کتاب ناطق وخبر	کے چار ذرائع ہیں، کتاب ناطق ، متفق علیہ
مجتمع علیہ وحجة عقل واجماع	روایت ، دلیل عقلی اور اجماع ،

من الامة (کتاب الاوائل ص ۹۵)

واصل کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل تھا، اور اس کا شاگرد ابو الہذیل العلاف ، ابو الہذیل کی شاگردی مدتوں امام شافعی نے کی تھی، اور انداز استدلال و استنباط انہی متکلمین سے سیکھا تھا، امام شافعی ہی عام طور پر پہلے مصنف سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اصول فقہ پر رسالہ لکھا، بعد کے لوگ ان ہی کے نقش قدم پر چلے، اس لیے اصول فقہ کا علم کلام سے متاثر ہونا فطری تھا، متاخرین شوافع (امام الحرمین اور امام غزالی) نے اصول فقہ کی کلاسیکی کتابیں لکھیں ،

کچھ لوگ اس اولیت کا شرف امام ابو حنیفہ اور ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسف کو دیتے ہیں لیکن

امام صاحب فقہ کو اپنانے سے پہلے عمر گرامی کا بڑا حصہ علم کلام میں صرف کر چکے تھے۔ اس لیے ان کے سلسلے میں معقولیت کا انداز نظری تھا، اور فقہائے حنفیہ اصول فقہ کے دو مسلکوں میں سے ایک مسلک (فقہی) کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

بہر حال اصول فقہ کے دو مسلک ہیں: متکلمانہ اور فقیہانہ۔ مقدم الذکر میں زیادہ اعتناء قواعد کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور پختگی استدلال نیز ایراد و دفع اعتراضات پر زور دیا جاتا ہے، موخر الذکر میں قواعد کے ساتھ ان کے امثلہ و نظائر بھی بیان کیے جاتے ہیں، اور فقہی نکات سے مسائل کی تفریع کی جاتی ہے۔

کلامی انداز پر لکھنے والوں کی دو جماعتیں ہیں، معتزلہ اور اشاعرہ

معتزلہ نے شروع سے اس موضوع پر کتابیں لکھیں، مگر زیادہ شہرت دو کتابوں کو ہوئی: عبدالجبار معتزلی کی "کتاب العہد" اور ابوالحسین البصری کی "شرح کتاب العہد"۔

اشاعرہ (شوافع) کی بھی دو کتابیں کلاسیکی حیثیت رکھتی ہیں، امام الحرمین کی "کتاب البرہان" اور امام غزالی کی "مستصفی الاصول"

بعد میں امام رازی نے چاروں کتابوں کو "کتاب المحصول" میں ملخص کیا۔ کتاب المحصول کا اختصار سراج الدین ارموی نے "محصل" کے نام سے اور تاج الدین ارموی نے "حاصل" کے نام سے کیا۔

کتب اربعہ (العہد، شرح العہد، برہان، مستصفی) کا دوسرا ملخص سیف الدین آمدی نے "کتاب الاحکام" میں کیا۔ امام رازی نے محصول میں استدلال و احتجاج پر زیادہ زور دیا تھا۔ آمدی نے تحقیق مذاہب و تفریع مسائل پر زیادہ توجہ دی،

امام رازی کی "کتاب المحصول" اور سیف الدین آمدی کی "کتاب الاحکام" کے مقدمات کو کچھ اضافوں کے ساتھ شہاب الدین قرافی نے "تنقیحات" میں مدون کیا، اسی طرح امام بیضاوی نے انکی مدد کر منہاج الاصول لکھی

Marfat.com

آمدی کی کتاب الاحکام کی ابن حاجب نے پہلے "المختصر الکبیر" میں اور پھر "المختصر الصغیر" میں تلخیص کی، جو اپنے وقت میں اس فن کی اہم کتاب سمجھی جاتی تھی۔

احناف نے اپنے رنگ میں متعدد کتابیں لکھیں، سب سے مشہور ابو زید دبوسی کی تقویم الادلہ ہے۔ کچھ دن بعد فخر الاسلام بزدوی نے "کشف الاسرار" لکھی جو "اصول بزدوی" کے نام سے عرصہ دراز تک قبل مغل ہندوستان کے نصاب میں مشمول رہی، بلکہ بزدوی جوان "العالم الالمعی والفاضل اللوذعی" کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔

بعدازاں ابن الساعاتی نے آمدی کی کتاب الاحکام اور کشف بزدوی کے مسائل کو "کتاب البدیع" میں جمع کر دیا، اس طرح یہ کتاب کلامی اور فقہی دونوں مسلکوں پر حاوی ہو گئی۔ کتاب البدیع کی توضیح مع شیئ زائد ابن الہمام نے "التحریر" میں کی۔

صدر الشریعہ نے توضیح میں کشف بزدوی کی وضاحت کی، بعد میں علامہ تفتازانی (شافعی) نے توضیح کی شرح (اور بقول بعض جرح) تلویح کے نام سے کی۔

اس مختصر سے تاریخی جائزے سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اصول فقہ پر کلام کا کس درجہ اثر تھا، یہی نہیں بلکہ بعض ابحاث کلام اور اصول فقہ میں مشترک ہیں، مثلاً "مباحث نظر" یا "مسئلہ حسن و قبح افعال"۔ کلام کے توسط سے اول الذکر منطق تک پہنچتا ہے اور آخر الذکر فلسفۂ الٰہیات تک، اس لیے اصول کی کماحقہ تعلیم کے لیے جو قبل مغل عہد کے درسی نصاب کا جزو اشرف تھی، معقولات کی تعلیم ضروری تھی۔

اور پانچویں صدی کے بعد سے تو منطق اصول فقہ کے لیے شرط اولین بن چکا تھا، اس سے پہلے فلاسفہ میں منطق کا اور متکلمین میں جدل کا رواج تھا، جسے وہ استدلال و استنباط کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مگر پانچویں صدی کے آخر میں امام غزالی نے جہاں فلسفہ و معقولات کو عمومی درس میں شامل کیا، منطق کو اصول فقہ کا جزو لاینفک بلکہ مبادی علیہ بنا دیا، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے "الرد علی المنطقیین" میں لکھا ہے:-

واول من خلط منطقهم باصول
المسلمين ابو حامد الغزالي و
تكلم فيه علماء المسلمين بما
يطول شرحه

منطق کو مسلمانوں کے اصول فقہ سے خلط ملط کرنے والے پہلے شخص ابو حامد غزالی ہیں۔ علمائے اسلام نے اس پر جو بحث کی ہے اس کی شرح طویل ہے۔

دوسری جگہ وہ "الامام الغزالی وعلم المنطق" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔

وانما كثر استعمالها من زمن
ابي حامد فانه ادخل مقدمة
في المنطق في اول كتابه المستصفى
وزعم انه لا يثق بعلمه الا من
عرف هذا المنطق وصنف فيه
معيار العلم ومحك النظر

منطق کا استعمال ابو حامد کے زمانہ سے زیادہ ہوا، انھوں نے اپنی کتاب المستصفی کے شروع میں منطق پر ایک مقدمہ لکھا ہے ان کا خیال ہے کہ جس شخص کو اس منطق سے واقفیت نہ ہو اس کے علم کا کوئی اعتبار نہیں اور انھوں نے منطق میں معیار العلم اور محک النظر تصنیف کیں

مثلاً "حد" (تعریف) کے متعلق امام غزالی سے پہلے جمہور متکلمین کا خیال تھا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جس چیز کی تعریف مقصود ہے اسے دوسری چیزوں سے ممتاز کر دے، اس کے برخلاف اہل منطق کا اصرار تھا کہ وہ اس کی تصویر کھینچ دے اور حقیقت کو متعارف کرا دے، مگر امام غزالی نے متکلمین کا مسلک چھوڑ کر منطقیوں کا مسلک اختیار کیا اور اس کی خاطر "مستصفی الاصول" میں ایک منطقی مقدمہ کا اضافہ کیا، حافظ الامام ابن تیمیہ نے لکھا ہے:۔

المحققون من النظار يقولون ان
الحد فائدته التمييز بين المحدود
وغيره كالاسم وليس فائدته

محققین متکلمین کہتے ہیں کہ حد کا فائدہ اسم کی طرح محدود کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ نہ کہ محدود کی تصویر کھینچنا، اور

Marfat.com

تصویر المحدود وتعریف
حقیقته وانما یدعی هذا
اهل المنطق.... وانما دخل
هذا فی کلام من تکلم فی اصول
الدین و (اصول) الفقه بعد
ابی حامد (الامام الغزالی)
فی اواخر المائة الخامسة
واوائل المائة السادسة
فاما ابو حامد فقد وضع
مقدمة منطقیة فی اول
المستصفی وزعم ان من لم
یعرف بها علما فلا ثقة له
بشیء من علوم وصنف فی
ذالک محک النظر ومعیار
العلم ولما اشتدت به نقمة
...... وهؤلاء الذین
تکلموا فی الاصول بعد ابی حامد
الذین تکلموا فی الحدود بطریق
اهل المنطق الیونانی

اس کی حقیقت ظاہر کرنا، یہ تو منطقیوں
کا دعویٰ ہے......... اور یہ
چیز اصول دین اور اصول فقہ
میں کلام کرنے والوں کے یہاں
امام غزالی کے بعد پانچویں صدی
کے اواخر اور چھٹی صدی کے اوائل
میں داخل ہوئی ہے، انھوں نے
مستصفی کے شروع میں ایک منطقی
مقدمہ لکھا ہے، اور ان کا خیال ہے
کہ جس شخص کو اس سے واقفیت
نہ ہو اس کی کسی علم میں مہارت کا
اعتبار نہیں، اس موضوع پر ابوحامد
نے محک النظر و معیار العلم تصنیف
کی۔ جس پر ان کو بڑا اعتماد تھا۔
ابوحامد کے بعد جن لوگوں نے
اصول پر بحث کی ہے ان ہی نے
یونانی منطق والوں کے طرز پر
حدود میں بحث کی ہے۔

Marfat.com

ہندوستان میں اس عہد کے اندر امام فخر الاسلام بزدوی کی کشف الاسرار (اصول بزدوی) اور امام حسام الدین کی حسامی مروج تھیں، مگر ان کتابوں کی کما حقہ تعلیم کے لیے اصول فقہ کی دوسری مستند کتابوں پر نظر ضروری تھی اور مستصفی بغیر منطق میں یدطولیٰ حاصل کیے حل نہیں ہو سکتی تھی،

پھر شرح شمسیہ قطب الدین رازی کی تصنیف ہے، جو غالباً آٹھویں صدی میں لکھی گئی اور شاید آٹھویں صدی کے آخر میں بعہد فیروز شاہ تغلق ہندوستان میں مروج ہوئی، اسی طرح شرح صحائف بھی، حالانکہ عربی مدارس ہندوستان میں چھٹی صدی کے آخر سے قائم ہونا شروع ہو گئے تھے (تفصیل آگے آئیگی) سوال یہ ہے کہ آٹھویں صدی سے پہلے بغیر شرح شمسیہ اور شرح صحائف کے اصول بزدوی (جو پہلے بھی متداول تھی) کس طرح پڑھی پڑھائی جاتی ہوگی، کلام کے سلسلے میں تو معلوم ہے کہ ابتدائی زمانہ میں "تمہید ابو شکور سلمی" کا رواج تھا، مگر منطق و معقولات کی کسی کتاب کے نام کی صراحت نہیں ملتی، حالانکہ منطق و فلسفہ اصول فقہ کی رگ و پے تک میں سرایت کر گئے تھے اور اس لیے اس کی کما حقہ تعلیم و تدریس (بزدوی خواں بننے کے لیے) کے واسطے ان علوم پر علیٰ وجہ البصیرۃ نظر ناگزیر تھی،

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ قبل مغل عہد کے ہندوستان میں علوم عقلیہ کی بھی گرم بازاری تھی، مگر اس کی تفصیل سے پیشتر ان اہم تاریخی اوقات کا تعین مستحسن ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں کی علمی سرگرمیوں کو عموماً اور معقولات کی تعلیم کو خصوصاً سریع سے سریع بنانے کے محرک ہوا کیے ہیں،

(معارف: جنوری ۱۹۶۳ء)

Marfat.com

②

ہندوایران کے روابط علمیہ | ہندوستان اور ایران کے ثقافتی روابط بہت قدیم ہیں۔ بعثت اسلام سے قبل بھی ان کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً حکیم برزویہ سنسکرت ادب و اخلاق کی کتاب کلیلہ ودمنہ (کذ لک: منا ک) کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس سے پہلے اردشیر اور شاپور کے زمانہ میں طب، فلسفہ وغیرہ کی کتابیں سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئیں۔ دوسری طرف یونانی ریاضی و ہیئت پہلے ایران اور باختر پہنچی۔ چنانچہ اولیری "یونانی علوم کی عربوں میں منتقلی" میں لکھتا ہے:

(مرو، باختر اور صغد یونانی ثقافت کے مرکز بنگئے تھے۔" (کتاب مذکور صفحہ ۱۱)

اور وہاں سے ہندوستان جہاں اس نے مقامی نجوم و ہیئت کو متاثر کیا۔ اولیری اسی کتاب میں (ص ۱۰۴) لکھتا ہے:۔

"گپتا خاندان کے عہد میں شہر پاٹلی پتر علمی مطالعہ کا مرکز بن گیا تھا۔ بالخصوص ہیئت و ریاضیات کا، ان دونوں پر قطعی طور پر اسی قسم کا یونانی اثر نمایاں ہے جو اسکندریہ کے معاصر مدارس میں رائج تھا۔"

مگر بعثت اسلام سے پہلے کے ہندی ایرانی روابط علمیہ موضوع زیر بحث سے باہر ہیں۔

عہد اسلام میں بھی یہ دوطرفہ روابط قائم رہے۔

۱۔ ۷۷۱ء میں سندھ کا ایک علمی وفد "برہم سدھانت" کا نسخہ لیکر بغداد پہنچا، جہاں منصور عباسی کے ایما سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے اسے عربی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ عرصے تک "السندھند الکبیر" کے نام سے مسلمان ہیئت دانوں میں مشہور رہا، بعد میں اسی کی بنیاد پر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے اپنی زیچ مرتب کی جو "اسلامی ہیئت" کا سنگ بنیاد سمجھی جاسکتی ہے، ہیئت کے علاوہ ہندوستان کا مخصوص علم الحساب بھی عربوں میں پہنچا اور عرصہ تک "الحساب الہندی" کے نام سے مسلمان ریاضی دانوں کی تصنیفی کوششوں کا موضوع بنا رہا، ہندوستان ہی سے وہ مخصوص ترقیم اعداد کا طریقہ مسلمانوں تک پہنچا، جسے وہ "الارقام الہندیہ" مگر یورپ والے Arabic Names کہتے ہیں، حساب و ہیئت کے علاوہ ہندو طب کی بہت سی کتابیں بھی برامکہ کے زیر سرپرستی عربی میں ترجمہ ہوئیں، ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی ایک مبسوط فہرست دی ہے، ان تراجم سے عرب اطباء نے بہت کچھ استفادہ کیا، چنانچہ قدیم ترین ایرانی طبیب علی بن ابن الطبری اپنی کتاب "فردوس الحکمۃ" میں جس طرح یونانی اطباء کے حوالے دیتا ہے، اسی طرح ہندوستانی اطباء مشرد اور ندان وغیرہ کے بھی حوالے دیتا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن زکریا الرازی نے اپنی تصانیف، بالخصوص "کتاب الحاوی" میں جابجا چرک اور دوسرے ہندو اطباء کے حوالے دیے ہیں،

اسی کے ساتھ بہت سے ہندی و سندی فضلاء نے عراق و ایران جاکر علوم دینیہ اور شعر شاعری میں درجۂ امامت حاصل کیا، امام اوزاعی کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ وہ سندی الاصل تھے، اسی طرح عمرو بن عبید جو معتزلی علم کلام کے بانی واصل بن عطاء کا دست راست تھا، بقول مسعودی سندی الاصل تھا، ابوعطاء بن یسار جس کے کلام کا اقتباس ابوتمام نے حماسہ میں دیا ہے، سندی تھا۔

ب۔ دوسری طرف عرب اور بغداد کے علماء و فضلاء سندھ اور ملتان اور بعد میں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جاکر یہاں کی علمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان میں قدیم ترین نام جس کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ قاضی موسیٰ بن یعقوب الثقفی کا ہے جنھیں محمد بن قاسم اپنے ہمراہ لایا تھا۔ اور فتح سندھ (سنہ ۹۳ھ) کے بعد یہاں کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ بعد کے لوگوں میں قاضی ابن ابی الشوارب اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مورث اعلیٰ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے اخلاف مغربی ہندوستان کے علمی خانوادوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ پانچویں صدی کے آغاز میں ابوریحان البیرونی ہندوستان آیا۔ اس نے یہاں آکر ہندو فلسفہ و ہیئت ہی نہیں سیکھا۔ بلکہ ہندوؤں کو بھی مسلم ریاضی و ہیئت سکھائی۔

اس کے بعد تو یہ دو طرفہ علمی روابط اور بھی مستحکم ہو گئے۔ بالخصوص ملوک سلاطین کے تخت دہلی پر متمکن ہو جانے کے بعد، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ بہرحال یہ ایک عام تاریخی واقعہ رہا ہے کہ ہر ثقافتی تحریک جو ایران میں ظہور پذیر ہوئی، ہندوستان پر بھی اثر انداز ہوئی۔ مگر یہاں صرف ہند و ایران کے علمی روابط کے ان اہم اوقات کی مختصر طور پر نشاندہی کرنا مقصود ہے جنھوں نے یہاں کے علمی حلقوں میں منطق و حکمت کی تعلیم کو خصوصیت سے متاثر کیا۔

تیسری صدی تک ہندوستان میں فلسفہ و معقولات کی تعلیم کی تفصیلات ہنوز دستیاب نہیں ہو سکی ہیں، خود عراق و ایران میں یہ فنون عام طور پر مروج نہ تھے۔ صرف حدیث و فقہ کا چرچا تھا۔ اور ہندوستان (سندھ و ملتان) کے اکثر لوگ حدیث ہی کے تعلم و تعلیم میں نظر آتے ہیں۔

عراق میں علوم فلسفیہ کی ترقی خاص طور سے تیسری صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ یہ مامون الرشید کی عقلیت پرستی اور "علوم الاوائل" (یونانی حکمت) کے ساتھ غیر معمولی شغف کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد بھی لوگوں کا اعتنا علوم عقلیہ کے ساتھ برقرار رہا، تا آنکہ متوکل باللہ کے زمانہ میں مدرسہ فلسفہ جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو آیا تھا، حران پہنچا،

Marfat.com

بعد میں جب انحلال خلافت سے فکری بے راہ روی بڑھنے لگی تو کھلے بندوں عقلی علوم لغداد میں داخل ہو گئے۔ یہ معتضد باللہ (۲۷۹ھ۔ ۲۸۹ھ) کا زمانہ تھا۔ اور اگلی صدی سے فلسفہ و معقولات دیگر اسلامی ممالک بالخصوص ہندوستان تک پہنچنے لگے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ تیسری صدی کے سرے پر باطنی (اسماعیلی یا قرمطی) تحریک ظہور میں آئی۔ اس سے فلسفہ و دیگر علوم عقلیہ کی اشاعت کو غیر معمولی مدد ملی۔ اس تحریک کا مقصد اسلام اور عرب حکومت کی بیخ کنی اور مجوسیت اور ایرانی سلطنت کا احیا تھا۔ اس حیثیت سے یہ ایک انقلابی و سیاسی تحریک تھی۔ مگر اس نے خود کو مستحکم اور پائدار بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اپنی آئیڈیالوجی فلسفہ پر قائم کی۔ چنانچہ شہرستانی نے قدماء باطنیہ کے بارے میں لکھا ہے:-

ثم ان الباطنية القديمة قد خلطوا كلامهم ببعض كلام الفلاسفة وصنفوا كتبهم على ذالك المنهاج	پھر قدیم باطنیوں نے اپنے کلام کو فلاسفہ کے بعض کلام سے مخلوط کر دیا۔ اور اپنی کتابیں اسی طرز پر تصنیف کیں۔

اور وہ فلسفیوں کو بڑی آؤبھگت کے ساتھ اپنی تحریک میں شامل کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن الحسن القیروانی نے ابو سلیمان الجنابی کو جو رسالہ بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا،

واذا ظفرت بالفلسفی فاحتفظ به فعلى الفلاسفة معولنا وانا واياهم مجمعون على القول بقدم العالم	جب تم کو کوئی فلسفی مل جائے تو اس کو اپنے قبضہ میں لے لو کیونکہ فلاسفہ پر ہمارا مدار ہے اور وہ قدم عالم کے عقیدے پر ہم سے متفق ہیں،

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے دعاۃ کو فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ بالخصوص ریاضیات کی خاص طور سے تعلیم

Marfat.com

دیتے تھے۔ ابو عبداللہ بن رزام سے جو اس تحریک کا قدیم ترین مورخ ہے، ابن ندیم نقل کرتا ہے:

ومن شان دعاتهم ان يتنقلوا في الارض ..... وان يتحلى بطرف من الهندسة وسمات من تهاويل	ان داعیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ دنیا کی سیاحت کرتے تھے، اور تھوڑی بہت ہندسہ اور فلسفہ سے واقفیت رکھتے تھے

چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی خود فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے، ابوالفضائل ہمدانی نے بانی باطنیت عبداللہ بن میمون القداح کے بارے میں لکھا ہے:-

وكان الملعون عارفاً بالنجوم ... وكان من احبار اليهود واهل الفلاسفة الذين عرفوا جميع	یہ ملعون فلسفہ کا ماہر تھا، اور ان احبار یہود اور فلاسفہ میں تھا جو فلسفہ کے تمام مذاہب سے واقفیت رکھتے تھے۔

اسی طرح محمد بن الحسین زیدان کے بارے میں ابن ندیم لکھتا ہے:-

وکان هذا الرجل متفلسفاً حاذقاً بعلم النجوم — یہ شخص فلسفی اور علم نجوم میں ماہر تھا۔

ابوالفضائل نے حمدان قرمط کو بھی نجوم کا ماہر اور ابوسعید الجنابی کو فلیسوف بتلایا ہے۔ بہرحال باطنیوں نے اپنی تحریک کو فلسفہ پر استوار کیا اور ان کے دعاۃ اپنے متبعین کو دعوت کے آخری منازل میں یونانی فلسفہ سے آشنا بنانے کی خصوصیت سے تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ مقریزی نے باطنی دعوت کی منازل میں سے چھٹی منزل کے بارے میں لکھا ہے:

نقله الداعی الی الكلام فی الفلسفة وحرضه على النظر فی كلام افلاطون وارسطو وفيثاغورث ومن فی معناهم	اس کو داعی نے فلسفہ میں بحث و نظر کی طرف متوجہ کیا اور افلاطون، ارسطو، فیثاغورث اور ان کے قبیلے کے دوسرے فلاسفہ کے اقوال پر غور و فکر پر آمادہ کیا۔

Marfat.com

اور آخری منزل میں تو اسے فلاسفہ کی کتابیں اور علوم فلسفیہ کے پڑھنے ہی کی تلقین کی جاتی تھی۔

احالۃ علی ما تقدمہ فی کتب الفلاسفۃ	اس کو ان چیزوں پر آمادہ کیا جو فلاسفہ
من علوم الطبیعیات وما بعد	کی کتابوں میں ثابت ہیں یعنی علم طبیعات
الطبیعۃ والعلوم الالٰہی وغیرہ	ما بعد الطبیعات، علم الٰہی اور ان کے علاوہ
ذٰلک من اقسام العلوم الفلسفۃ	دوسری قسم کے علوم فلسفہ

اس طرح سے اسماعیلیت اور قرمطیت خود فلسفہ کی اشاعت کا قوی سبب بن گئی۔ ان کے مذاکرات کا محور مسائل فلسفیہ ہی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سینا اپنے باپ کے بارے میں لکھتا ہے:-

وکان ابی ممن اجاب داعی المصریین	میرے والد نے مصریوں کے داعی کی دعوت
ویعد من الاسماعیلیۃ	قبول کی اور ان کا شمار اسماعیلیہ میں
ویجرون علی السنتھم ذکر	ہوتا ہے..... ان لوگوں کی زبان پر
الفلسفۃ والھندسۃ و	فلسفہ، ہندسہ اور ہندی حساب
حساب الھند	کا ذکر رہتا ہے۔

تفلسف اور قرمطیت کے اس باہمی لزوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں "فلسفی" بھی اتنا ہی مبغوض سمجھا جانے لگا جتنا کہ ایک اعدامی (Nihilist) قرمطی، بالخصوص ہندوستان میں، اس لیے فلاسفہ اپنے کو فلسفی نہیں کہتے تھے۔ ابن سینا اور اس کے تلامذہ تو فقہا کی طرح رہتے تھے۔ (اور خود کو فقیہ ہی کے نام سے موسوم کرتے تھے، ہندوستان میں علوم حکمیہ (معقولات) کے ماہرین "دانشمند" کہلاتے تھے۔ اس لئے لوگوں کو شبہہ ہوا کہ اکبر کے دین الٰہی سے پہلے ہندوستان میں فلسفہ کی تعلیم کا رواج ہی نہ تھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال فلسفہ وحکمت میں اپنے دعاۃ کی تربیت کرنے کے بعد اسماعیلی تحریک کے بانیوں نے

131242

Marfat.com

انھیں ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا، اس لیے غالباً چوتھی صدی کی ابتدا ہی سے ہندوستان (سندھ و ملتان) میں بھی اسماعیلی دعاۃ کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور انھوں نے انقلاب کے لیے یہاں زمین ہموار کرنا شروع کی،

پہلے ملتان میں کامیابی ہوئی جہاں سنہ ۲۱۱ھ سے بنو منبہ کی سنی حکومت قائم تھی، اور جو ۳۷۲ھ کے قریب تک رہی، کیونکہ جب ۳۶۷ھ میں ابن حوقل یہاں آیا تو اس نے سنی مذہب ہی پایا، ۳۷۲ھ کے بعد عضد الدولہ دیلمی کی وفات پر فاطمی خلیفہ العزیز باللہ نے دیگر اقطار عالم کی طرح ایک شخص جلم بن شیبان کو ملتان بھیجا، یہ علاقہ پہلے ہی سے انقلاب کے لیے تیار تھا، اس لیے جلم نے ۳۷۵ھ سے پہلے یہاں اسماعیلی حکومت قائم کر لی، کیونکہ جب مقدسی یہاں آیا تو اس نے ملکی مذہب تشیع پایا، جلم نے ملتان میں قابض ہو کر یہاں کے مشہور بت کو توڑ ڈالا، چنانچہ البیرونی نے "کتاب فی تحقیق ما للہند من مقولۃ" میں لکھا ہے:

فلما استولت القرامطة على	جب قرامطہ ملتان پر قابض ہو گئے تو جلم
الملتان کسر جلم بن شیبان	ابن شیبان نے یہاں کے بت کو توڑ
المتغلب ذالك الصنم و	ڈالا اور اس کے پجاری کو قتل
قتل سدنته	کر دیا،

مگر جلم کے جانشین لائق نہ تھے، ادھر خراسان میں محمود غزنوی ۳۸۸ھ میں بادشاہ ہوا جو قرامطہ کا دشمن تھا، اس نے داؤد حاکم ملتان کی معاندانہ ریشہ کاریوں سے تنگ آکر [تفصیل آگے آرہی ہے] ۴۰۱ھ میں حملہ کر کے اسے تہس نہس کر ڈالا، یہاں سے ناکام ہو کر اسماعیلی منصورہ (سندھ) پہنچے، جو غالباً انقلاب کے لیے تیار ہو چکا تھا، اور وہاں اسماعیلی حکومت قائم کر لی، مگر ۴۱۶ھ میں محمود نے خفیف والی منصورہ کو شکست دے کر سندھ کو بھی فتح کر لیا،

Marfat.com

مگر ملتان کے اس حکومتی انحلال سے قرامطہ کا زور ختم نہیں ہوا، کیونکہ جب پانچویں صدی کے آخر میں غزنوی حکومت کمزور ہوگئی تو انھوں نے پھر ملتان پر قبضہ کر لیا، پھر انہی قرامطہ سے ۵۷۱ھ میں محمد غوری نے ملتان کو چھینا، لیکن وہ بھی ان کا پورے طور پر استیصال نہ کر سکا، کیونکہ یہیں کے ایک فدائی کے ہاتھ سے وہ ۶۰۲ھ میں شہید ہوا، بعد میں قرامطہ کی سرگرمیاں دہلی تک پہنچ گئیں، اور رضیہ کے عہد میں ترک کے زیر قیادت انھوں نے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی، اور اگرچہ اس میں وہ ناکام رہے۔

غرض جنوبی مغربی ہندوستان میں عراق و ایران کی قرمطی تحریک کا اثر چوتھی صدی کے آغاز سے چھٹی صدی کے آخر تک رہا، اور چونکہ اسمٰعیلی تعلیم میں فلسفہ و حکمت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس لیے یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اسماعیلیوں کی دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں فلسفہ و حکمت کی تعلیم کی بھی گرم بازاری ہوئی ہوگی، اگرچہ خفیہ طور پر، اسی لیے اس کی تفصیلات دیگر خفیہ تحریکوں کی طرح پردۂ خفا میں ہیں۔

۲- پانچویں صدی کے آغاز میں ایران میں اسلامی فلسفہ کی مثلِ اعظم شیخ بوعلی سینا کا ظہور ہوا، مشرق میں فلسفہ اور شیخ بوعلی سینا مترادف الفاظ ہیں، شیخ کا شاگرد رشید بہمنیار اور اس کا شاگرد ابو العباس اللوکری تھا، ابو العباس اللوکری ہی سے خراسان میں فلسفہ کی تعلیم پھیلی، بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ میں لکھا ہے:

ومن الادیب ابو العباس انتشرت	اور ادیب ابو العباس کے ذریعہ خراسان میں
علوم الحکمۃ بخراسان	علوم حکمت پھیلے۔

اس وقت لاہور آخری دور کے غزنوی سلاطین کا مستقر حکومت تھا، اور جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا یہاں دیوان کتابت کے امیدوار عہدیداروں کی تنظیم کے لیے فلسفہ و حکمت کا بھی

رواج تھا۔ لہٰذا جب خراسان میں ابوالعباس اللوکری کی توجہ سے فلسفہ و حکمت کی گرم بازاری ہوئی تو اس نے لاہور اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو بھی متاثر کیا، مگر افسوس اس عہد کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ عوفی نے شعراء میں ایک مشہور کاتب یوسف بن محمد دربندی کا ذکر کیا ہے، جو جمال الفلسفہ کہلاتا تھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس عہد کے لاہور میں اور بھی فلاسفہ تھے، جن کے گل سرسبد یوسف بن محمد دربندی تھے۔ معقولات کے دوسرے فضلا کے نام آگے آرہے ہیں،

۳۔ چھٹی صدی کا آخر امام رازی کا زمانہ ہے، جو معقولات (علم استدلالی) کے مظہر اتم سمجھے جاتے تھے، اسی پر فخر کرتے ہوئے مولانا روم نے فرمایا تھا،

گر بعقل و رائے کار دیں بدے   فخر رازی راز دار دیں بدے

اقصائے عالم سے لوگ آکر ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ ساتویں صدی میں ان کے تلامذہ عالم اسلامی میں پھیلنا شروع ہوئے، سیاسی حالات بھی اسی کے مقتضی تھے، تاتاریوں کی چیرہ دستیوں سے دنیائے اسلام میں قیامت برپا تھی، مغرب میں صرف مصر اور مشرق میں ہندوستان بچا ہوا تھا۔ اس لیے ان کے بہت سے تلامذہ ہندوستان آئے اور یہاں آکر حکمت و معقولات کی تعلیم کو ترقی دی، اس کی تفصیل آگے آئے گی،

۴۔ ساتویں صدی کے وسط میں ایران میں ایک اور عبقری پیدا ہوا، یہ محقق طوسی تھے، جنھوں نے بوعلی سینا کے فلسفہ کی تجدید کی، بقول صاحب مجالس المومنین :-

"جاملم تحقیقات ابوعلی راکہ بتصادم شبہات ابوالبرکات یہودی و تشکیکات فخرالدین رازی باندراس رسیدہ از غایت علو حکمت و کمال ادراک، استدراک نمود۔"

محقق طوسی کی تجرید فی الکلام" معقولات میں ایک بلند مقام رکھتی ہے، علمائے عجم نے شرح و تحشیہ

Marfat.com

کے ذریعے اس کے ساتھ غیر معمولی اعتنا کیا، اور نویں صدی میں انھوں نے ہندوستان میں مقبولیت حاصل کرلی، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مگر آٹھویں صدی میں محقق طوسی کے تلامذہ کے شاگردوں نے ہندوستان آکر نہ صرف یہ کہ یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا، بلکہ معقولات کی تعلیم کا بازار بھی گرم کردیا، محقق طوسی کے شاگرد قطب الدین شیرازی کے شاگرد قطب الدین رازی تھے، امام الدین ریاضی لکھتے ہیں:

"شمس فلک المحققین ونیر کوکبہ المدققین العلامۃ قطب الدین محمد بن مسعود مصلح الشیرازی ...... در حکمت شاگرد خواجہ نصیر الدین طوسی است ...... عامر الکنا نقین ظاہر المطیبین محور فلک الحکمۃ والدین المزلی قطب الدین الرازی ...... علم از علمائے کبار اخذ نمود ازانجملہ است مولانا قطب الدین علامہ شیرازی"

قطب الدین رازی کے شاگرد مولانا جلال الدین رومی تھے، جو ہندوستان آکر فیروز تغلق کے مدرسہ کے صدر ہوئے، انہی نے یہاں "شرح شمسیہ" کو داخل درس کیا، ان کے تلامذہ میں شیخ یوسف ابن جمال ملتانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس عہد کے ایک دوسرے فاضل مولانا نجم الدین سمرقندی تھے، جنھیں فیروز تغلق نے بالا بند سیری کے مدرسہ کا صدر مقرر کیا تھا۔

۵۔ آٹھویں صدی کے فضلائے شیراز کے گل سرسبد قاضی عضد الدین الایجی تھے، جو ابو اسحاق والی شیراز کے دربار کے پانچ نورتنوں میں سے ایک تھے، حافظ کہتے ہیں:

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف   بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

یہ محمد تغلق (۷۲۵ھ-۷۵۲ھ) کا زمانہ تھا، وہ دل وجان سے چاہتا تھا کہ دربار ابو اسحاق کا یہ گوہر درخشاں اس کے دربار کی زینت بنے، اس لیے اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو انھیں بلانے کے لیے شیراز بھیجا، مگر ابو اسحاق کے احسانات قاضی عضد پر اتنے عظیم تھے کہ وہ نہ آسکے، مولانا غلام علی آزاد نے

Marfat.com

"سبحۃ المرجان" میں لکھا ہے:-

ارسله (مولانا معین الدین العمرانی)	سلطان محمد بن تغلق بادشاہ ہندوستان نے
السلطان محمد بن تغلق شاہ دہلی	مولانا معین الدین عمرانی کو بے شمار ہدایا
الهند.... الی القاضی عضد الدین	وتحائف کے ساتھ قاضی عضد الدین
الایجی بتحف واتحف الیه	الایجی کے پاس شیراز بھیجا، اور ان کو
هدایا غیر محصورة والتمس	ہندوستان آنے کی درخواست کی
بالهند قدومه..... فامسکه	لیکن سلطان ابو اسحاق نے ان کو
السلطان ابو اسحق وبجم تقییده	احسانات سے گرانبار کرکے
بسلسلة الاحسان علی الاطلاق	روک لیا۔

قاضی عضد المواقف فی الکلام کے مصنف ہیں، جو اس فن کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، اکثر سلاطین وقت اسے اپنے نام پر ممنون کرانا چاہتے تھے، چنانچہ وہ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

"کم امنا ابکار الجنان.... وکنت برھۃ من الزمان.... اشار دوذی النہی من احد فانی مع تعدد خاطبیہا"۔

ان "طلبگاروں" میں محمد تغلق بھی تھا کیونکہ میر سید شریف "خاطبیہا" کی شرح میں لکھتے ہیں "ومن جملۃ خاطبیہا سلطان الہند محمد شاہ جونہ"۔

قاضی عضد تو ہندوستان نہ آسکے لیکن ایران کے اور فضلا یہاں تشریف لائے، ان میں مولانا صدر شریف سمرقندی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، وہ علوم حکمیہ بالخصوص ہندسہ وہیئت میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے "منجم" کہلاتے تھے۔ وہ سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے زمانہ میں دکن آئے، اور عرصہ تک صدر مملکت کے عہدہ پر رہے۔

Marfat.com

۶۔ قطب الدین رازی کے مشہور شاگرد تفتازانی (المتوفی ۷۹۲ھ) تھے، جو بعد میں تیمور کے دربار کی زینت بن گئے تھے۔ وہ اپنے علم وفضل کی بنا پر علامہ کہلاتے ہیں، ان کے اکثر شاگرد ہندوستان میں آئے ان میں میر فضل اللہ انجو زیادہ مشہور ہیں، جو فیروز شاہ بہمنی کے استاد تھے، ان ہی سے اس نے معقولات و ریاضیات کا ذوق اخذ کیا تھا۔ فیروز شاہ بہمنی کے دربار میں اور بھی ایرانی فضلا آئے، ان میں حسن بن علی گیلانی اور سید محمود گاذرونی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، انہی کی تولیت میں فیروز شاہ بہمنی نے بالاگھاٹ پر رصدگاہ تعمیر کرنے کا انتظام کیا تھا جو ہندوستان میں پہلی رصدگاہ تھی۔

علامہ تفتازانی کے دوسرے مشہور شاگرد مولانا موسیٰ الجبری تھے، جو دہلی تشریف لائے، ان سے مولانا فتح اللہ ملتانی نے تعلیم حاصل کی تھی۔

تیسرے مشہور شاگرد مولانا شاء الدین ملتانی تھے، وہ علامہ کے فضل وکمال کا شہرہ سن کر ان سے پڑھنے ایران گئے تھے، وہاں سے واپس ہوکر معقولات کی تعلیم پر خصوصیت سے توجہ دی۔ ان کے شاگرد مولانا سماء الدین اور مولانا فتح اللہ تھے، موخر الذکر کے شاگرد مولانا عبد اللہ اور مولانا عزیز اللہ تھے، جنھوں نے دہلی جاکر معقولات کی تعلیم کو خصوصیت سے ترقی دی، مولانا عزیز اللہ کے شاگرد میاں حاتم سنبھلی تھے، جو اپنے وقت میں معقول ومنقول دونوں میں مشار الیہ سمجھے جاتے تھے،

۷۔ قاضی عضد کے شاگرد رشید میر سید شریف تھے، جو اپنی "شرح المواقف" کے لیے مشہور ہیں، اس زمانہ میں پنجاب کے ایک مشہور عالم کمال الدین تھے، جن کے اخلاف میں آگے چل کر مولانا الہداد سلطانپوری بہت مشہور ہوئے۔ مولانا کمال الدین میر سید شریف سے پڑھنے گئے اور واپس آکر معقولات کی تعلیم کو نیا رواج دیا۔

۸۔ نویں صدی کے آغاز میں محقق دوانی کے علم وفضل کی شہرت تھی، جنھیں محقق طوسی کے بعد قوم نے محقق کے خطاب سے مخاطب کیا۔ انھوں نے شرح تجرید قوشجی پر تین حاشیے لکھے، قدیم،

جدیدہ اور اجد۔ ان میں سے حاشیہ قدیمہ ایران و ترکی کے علاوہ ہندوستان میں بھی بہت زیادہ مقبول ہوا اور اکثر علما نے تدریس و تحشیہ کے ذریعہ اس سے اعتنا کیا۔

مگر محقق دوانی کا ہندوستان میں معقولات کی نشر و اشاعت پر خاص احسان ہے۔ یہاں کے اکثر علمی خاندانوں کا سلسلۂ تلمذ محقق دوانی تک پہنچتا ہے۔ ان کے متعدد شاگرد یہاں تشریف لائے جن کی وجہ سے اس ملک میں معقولات کا بہت زیادہ رواج ہو گیا۔

محقق دوانی کے دو شاگرد ابوالفضل گاذرونی اور ابوالفضل استرآبادی گجرات آئے۔ ابوالفضل گاذرونی کے شاگرد شیخ مبارک اور ابوالفضل استرآبادی کے شاگرد وزیر آصف خاں (عبدالعزیز الگجراتی) تھے۔ تیسرے شاگرد ملا عماد طارمی تھے۔ وہ بھی گجرات آئے۔ ان کے شاگرد مولانا وجیہ الدین گجراتی تھے۔ جو ایک کثیر الدرس اور کثیر التصنیف عالم تھے۔ علوم دینیہ و ادبیہ کے علاوہ انھوں نے فلسفہ و حکمت اور ریاضی و ہیئت کی متعدد کتابوں پر بھی شروح و حواشی لکھے تفصیل آگے آئے گی۔

ایک اور شاگرد میر رفیع الدین صفوی تھے۔ مگر انھوں نے حدیث کے ساتھ اعتنا کیا۔ بعد میں صفویوں کے مظالم سے تنگ آکر ہندوستان چلے آئے جہاں وہ آگرہ میں حدیث کا درس دیتے تھے۔

محقق دوانی کے شاگرد رشید خواجہ جمال الدین محمود الشیرازی تھے۔ وہ بھی صفویوں کے مظالم سے تنگ آکر مکہ معظمہ جاتے ہوئے آخر کار میر رفیع الدین کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔ خواجہ جمال الدین محمود کے شاگرد مرزا جان شیرازی تھے۔ جن سے وہ سلسلہ چلا جس میں میرزاہد اور شاہ ولی اللہ تک ہیں۔

خواجہ جمال الدین محمود کے دوسرے شاگرد میر فتح اللہ شیرازی تھے۔ جو بعد میں میر غیاث الدین منصور کے شاگرد ہو گئے تھے۔ انھوں نے مولانا کمال الدین مسعود شروانی اور مولانا کرد سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ پہلے امیر فتح اللہ کے شاگرد میر عنایت اللہ دکن آئے اور علی عادل شاہ کے مقرب خاص ہو گئے۔ بعد میں ان کے ایما پر امیر فتح اللہ بھی دکن چلے گئے۔ جہاں بادشاہ نے وکیل دربنا دیا۔ مگر کچھ دن بعد سیاسی انتشار سے پریشان ہو کر پہلے عبدالرحیم خانخاناں کے پاس گجرات گئے۔ پھر اکبر کی طلب پر ۹۹۱ھ میں لاہور پہنچے۔ اکبر نے بڑے

Marfat.com

عزت واحترام سے انھیں نوازا، امیر فتح اللہ ہی نے علمائے ولایت کی کتب معقولات کو ہندوستان میں رواج دیا، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :۔

"تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان را میر بہ ہندوستان در حلقۂ درس انداخت"۔

محقق دوانی کے ایک اور شاگرد میر حسین میبذی تھے، انھوں نے اثیر الدین ابہری کی "ہدایۃ الحکمۃ" کی شرح لکھی تھی، جو بعد میں "میبذی" ہی کے نام سے مشہور ہو گئی، وہ خود تو ہندوستان تشریف نہیں لائے مگر ان کی "میبذی" آجتک یہاں داخل درس ہے، اور اکثر علما نے اس پر حواشی و تعلیقات لکھے ہیں،

۹۔ آٹھویں صدی میں تیمور برق باد بن کر اٹھا، اور ہندوستان سے روم تک تہلکہ مچا دیا۔ مگر باہمہ کشور کشائی و ملک گیری اس نے علم و ہنر کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور سمرقند کو مجمع فضلائے دہر بنا دیا، انھیں فضلا میں علامہ تفتازانی اور میر سید شریف بھی تھے، علم و فضل کی یہ سرپرستی اس کی اولاد میں بھی باقی رہی، اس کا پوتا الغ بیگ، ریاضی و ہیئت کا زبردست عالم تھا، اس نے سمرقند کی مشہور رصدگاہ الغ بیگ" تعمیر کرائی۔ اس زمانہ میں معقولات کے ساتھ اعتنا عام ہو گیا تھا، اور نویں صدی میں اس کا چرچا اور بڑھ گیا۔ اس عہد کے خراسان و ماوراء النہر کے فضلا میں مولانا عصام الدین ابراہیم محمد سرخ اور احمد جند وغیرہ مشہور ہیں، ماوراء النہر کے اکثر فضلا ہندوستان تشریف لائے۔ جیسے مولانا یونس سمرقندی جو علوم حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ سندھ تشریف لائے جہاں مرزا شاہ حسین نے ان سے شرح مواقف پڑھی۔

۹۳۳ھ میں جب بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دے کر یہاں مغل سلطنت قائم کی تو ماوراء النہر کے علما، جوق در جوق آنے لگے، عہد بابری کے مشاہیر علما میں زین الدین خوافی، مولانا

Marfat.com

محمد سعید خراسانی، مولانا محمد سعید ترکستانی اور مولانا ابوالبقا خراسانی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، مولانا محمد سعید ترکستانی معقولات میں باکمال تھے۔

بابر کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا، جو خود ریاضی و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتا تھا، اور اس فن کے ماہرین کا جویا رہتا تھا، اس لیے اس نے اردبیل سے مولانا الیاس اردبیلی کو بلایا، اسی زمانہ میں ایک اور فاضل نورالدین سعیدونی آئے اور بہت جلد بادشاہ کے مقرب خاص ہو گئے۔ دوسرے آنے والوں میں شیخ محمد بن علی سمرقندی اور میر عبداللطیف قزوینی مشہور ہیں۔ مقدم الذکر نے محمد بن محمود آملی کی "نفائس الفنون" کے انداز پر "جواہر العلوم" لکھ کر ہمایوں کے نام معنون کی،

اسی عہد میں ماوراء النہر میں کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ وہاں کے فضلائے معقولات ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوئے، ایران جا نہیں سکتے تھے، کیونکہ سنی تھے، اس لیے ہندوستان کا رخ کیا، تیموریوں کے بعد ماوراء النہر میں ازبک خاندان کی حکومت قائم ہوئی، خدا جانے ان کا دل علماء سے صاف نہ تھا، یا علماء و مشائخ کی چشمک تھی یا واقعی ان معقولیوں نے معقول کو نامعقول حد تک پہنچا دیا اس لیے خواجہ عزیزان بخارائی کے ایما سے عبداللہ خاں ازبک نے ملا عصام الدین اسفرائینی اور ان کے تلامذہ کو توران سے نکال دیا، اور منطق و معقولات کی تعلیم پر پابندی لگا دی

بدایونی نے لکھا ہے:۔

"و باعث بر اندختن عبداللہ خاں پادشاہ توران زین فن منطق و علم جدل را واخراج ملا عصام الدین اسفرائینی مع جماعت طلبہ از ماوراء النہر و و خواجہ عزیزان بخارائی شدہ بود باین تقریب کہ چوں ایں علم در بخارا و سمرقند شائع شد خباثت شریر بر جاہلے سلیم القلب وا میدیہ مذہبی گفتند کہ ایں عبارت است چرا کہ لاحیوان از و مسلوب است و چوں انتفاء عام مستلزم انتفاء خاص است سلب انسانیت نیز لازم می آید و امثال

ایں مغالطات چوں کثیر الوقوع والشیوع شد، عزیزان روایت نقلی نوشتہ عبداللہ خاں را تحریض و ترغیب بر اخراج ایں جماعہ نمودو نامشروعیت تعلم تعلیم منطق و فلسفہ بدلائل ثابت کردو نیز روایتے نمود کہ اگر بکاغذے کہ منطق دراں نوشتہ باشد، استنجا نمایند باکے نیست۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر علماء ماوراء النہر ہندوستان چلے آئے، جیسے قاضی نظام بدخشی، حافظ کوکی، مرزا مفلس اوزبک، قاضی عبدالسمیع وغیرہم۔

(معارف: فروری ۱۹۶۳ء)

(۴)

۱۰۔ ماوراءالنہر سے بھی عجیب تر حالات ایران میں رونما ہو رہے تھے جو ہندوستان میں حکمت و معقولات کے ساتھ اعتناء کے لیے محرک قوی بن گئے۔

دسویں صدی کے آغاز میں ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی۔ یہ ایک قسم کی "قومی ریاست" (National State) تھی۔ اس لیے رجعت پسند احیائی "(Revivalist) تحریکوں کو پھر سے سر اٹھانے کا موقعہ ملا۔ یہ مذہبی انقلابی تحریکیں تھیں۔ اور انھوں نے سابق کی اسلام دشمن تحریکوں کی طرح اپنی تنظیم فلسفیانہ بنیادوں پر رکھی تھی۔ ان میں دو تحریکیں زیادہ اہم تھیں: پسیخانی یا فرقہ نقطویہ اور پارسیوں میں فرقہ آذر کیوانیہ۔

۱۔ نقطوی تحریک کا بانی محمود پسیخانی تھا، جو شروع میں حروفی فرقے کے بانی فضل اللہ کا متبع تھا مگر بعد میں اس نے ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس کا نام "نقطویت" ہے، کیونکہ بقول صاحب دبستان مذاہب:

"شخص واحد نقطہ گوید و خاک را می خواہد و عناصر دیگر بزعم او از خاک موجود اند......

و خاک را بیرون از عنصر نداند و واجب وجود اول نقطۂ خاک را شمرد۔"

محمود پسیخانی بھی پچھلے ملاحدہ کی طرح خود کو نہ صرف نبوت کا بلکہ الوہیت کا مظہر سمجھتا تھا۔ چنانچہ بتصریح صاحب دبستان المذاہب اس کے متبعین کہتے تھے: "چوں جسد کامل ترشد از اں محمود سر بر زد و بہشت مقلما محمود اخبر آن ست۔"

ان خرافات و اباطیل سے تو سلاطین کو زیادہ مطلب نہیں تھا مگر اس کے ادعائے مہدویت سے انھیں خطرہ ہونے لگا کہ وہ "محمود خود را شخص واحد نامد و مہدی موعود داند کہ نبی ﷺ خبر دادہ و گوید کہ دین محمد منسوخ شد اکنون دین دین محمود است۔"

Marfat.com

چونکہ سابق کی ملحدانہ احیائی تحریکوں کی طرح نقطوی تحریک بھی ایران کے قومی مزاج کے لیے بڑی خوشگوار تھی، اس لیے اس کے پیروؤں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ شاہ طہماسپ اور سلطان محمد خدابندہ نے اس کی اصلاح کی کوشش کی مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ شاہ عباس صفوی نے بڑی سختی سے مواخذہ شروع کیا اور ۱۰۰۲ھ میں بیشمار نقطوی قتل کر دیے گئے، ان میں میر سید احمد کاشی بھی تھا۔ اس کے کاغذات میں جو رسالے ملے ان سے معلوم ہوا کہ:-

"نقطوی حکما، کے مذہب کے مطابق عالم کو قدیم مانتے ہیں اور حشر اجساد اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک اعمال کے اچھے یا برے ہونے کے نتیجے میں جو دنیوی عافیت یا ذلت ملتی ہے، وہی بہشت و دوزخ ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقطویوں نے بھی اپنی آئیڈیالوجی فلسفہ کی تعلیم پر استوار کی تھی،

شاہ عباس کی دار و گیر سے نقطویوں کے لیے ایران میں رہنا ناممکن ہو گیا، اور وہ یا تو تقیہ کرنے پر مجبور ہوئے جیسا کہ صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے،

"و پیروان او در ربع مسکون متفرق اند و در ممالک ایران زمین بسیار اند اما خود را آشکارا نیارند ساخت چہ علیین آشنائی شاہ عباس جمعے کثیر از آنہا را کشت"

یا بھاگ کر ہندوستان چلے آئے، جہاں اکبر اس قسم کی بدعات کا دل و جان سے قدردان تھا، بدایونی کا خیال ہے کہ ایران سے آنے والے شعرا، کی اکثریت الحاد پسند تھی:

"تمامی شعراء عصر کلہم و جلہم صغیرہم و کبیرہم مگر سہ چہار نفر از قدمائے معمر و رتی حیدری مشرب اند"

ان میں غزالی اور قاسم کاہی سرآمد ملاحدہ روزگار تھے، بدایونی آگے چل کر لکھتا ہے:-

"اما ایں ہر دو مقتدا و پیشوائے بے بہرہ بودند کہ وراثت خباثت را باتباع و اشیاع خویش بقدر مناسبت و استعداد ذاتی و بفیض صحبت گزشتہ تقسیم کردند"

Marfat.com

ان ملاحدہ میں محمد شریف آملی، حیاتی کاشی، تشبیہی، عرفی، مازندرانی، سعادت اللہ کاشی،
عبد الغنی یزدی (المدمرکبی) بسیخوانی تھے۔ شریف آملی سے اکبر کو اپنی الحاد پسندی میں بڑی تقویت
حاصل ہوئی، کیونکہ اس نے اکبر کو وقت کے "صاحب الزمان" کا مصداق ثابت کرنے کی بھی کوشش
کی تھی، اور بقول بدایونی سنہ ۹۹۰ھ میں دنیا پرست علماء نے اس بات کی تائید میں دلائل تراشنا شروع
کیے کہ "جنگ ہفتاد و دو ملت" میں فیصلہ کرنے والا عرف اکبر ہی ہے اور شریف آملی نے محمود بسیخوانی
کے رسالوں سے شواہد پیش کیے کہ سنہ ۹۹۰ھ میں "صاحب دین حق" کا ظہور یقینی ہے۔ اور اس کا مصداق حضرت
اکبر کی ذات ہے۔

غرض یہ الحاد پسند شعراء، خواہ بسیخوانی ہوں جیسے شریف آملی وغیرہ یا وارستہ مزاج تیز مذہبی
سے آزاد جیسے قاسم کاہی وغیرہ علوم حکمیہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے، مثلاً قاسم کاہی کے متعلق بدایونی لکھتا ہے:-
"از علم تفسیر و ہیئت و کلام و تصوف او را بہرۂ تمام بود" یا تشبیہی کاشی کے متعلق لکھتا ہے:
"دعوت الحاد می نماید و مردم را بکیش بسیخوانیان میخواند و شیخ ابوالفضل خود را مجتہد و انامدہ"۔ اس تغلسف پسندی
سے شعرائے ہندوستان بھی متاثر ہوئے، چنانچہ فیضی کہتا ہے:-

امروز نے شاعرم حکیم دانندۂ حادث و قدیم

اس کا اثر معاشرہ کے ذوق و مزاج پر پڑنا ناگزیر تھا۔ اس لیے فطری طور پر اس ملک کے علمی حلقوں
میں فلسفہ و حکمت سے اعتناء بڑھنے لگا۔

ب۔ دوسری تحریک پارسیوں میں آذرکیوانیوں کی تھی، اس کا بانی آذرکیوان ایران قدیم کے
ایک نجیب الطرفین خاندان سے تعلق رکھتا تھا، ایرانیوں کا خیال تھا کہ ان کے یہاں قدیم زمانے سے فلسفہ
و حکمت کا چرچا رہا ہے۔ اس لیے جب کبھی ایران میں کوئی احیائی تحریک اٹھی تو اس نے اس مزعومہ
"ایرانی حکمت" (حکمت مشارقہ) کے احیاء کی بھی کوشش کی، کیونکہ یونانی فلسفہ کی کورانہ تقلید

Marfat.com

ذہنی غلامی کے مترادف تھی۔ چنانچہ تیسری صدی میں ابوبکر بن زکریا الرازی نے حسب تصریح امام رازی و میر سید شریف "حرانیت" کو دوبارہ زندہ کیا جو قدیم ایرانی "زرادشتیت" کی ایک شکل تھی، پانچویں صدی کے آغاز میں شیخ بو علی سینا نے اس مزعومہ ایرانی حکمت کو "الحکمۃ المشرقیہ" کے نام سے مدون کیا، مگر بدقسمتی سے ۴۲۶ھ میں یہ کتاب ضائع ہوگئی۔ چھٹی صدی کے آخر میں شہاب الدین سہروردی مقتول نے بزعم خود ایران قدیم کے اس فلسفی ورثہ کو "حکمۃ الاشراق" میں مدون کیا، چنانچہ علامہ قطب الدین شیرازی نے "شرح حکمۃ الاشراق" کے مقدمہ میں لکھا ہے:-

حکمۃ الاشراق ای حکمۃ	حکمت الاشراق یعنی ایسی حکمت جس کی بنیاد
الموسسۃ علی الاشراق الذی	اشراق پر رکھی گئی، اشراق کے معنی کشف یا
هی الکشف او حکمۃ المشارقۃ	حکمت مشارقہ کے ہیں، یہ لوگ اہل فارس
الذین هم اهل فارس ایضاً	میں سے تھے۔ اس لیے اس حکمت کا مرجع
یرجع الی الاول لان حکمتهم	بھی اول حکمت کی جانب ہے کیونکہ ان کی
کشفیۃ..... وکان اعتماد	حکمت کشفی ہے۔ اور حکمت میں
الفارسیین فی الحکمۃ علی	فارسیوں کا اعتماد ذوق اور کشف
الذوق والکشف	پر تھا۔

خود سہروردی اس "طریق اشراق" کو حکمائے ایران کی خصوصیت بتاتا تھا۔ چنانچہ "حکمۃ الاشراق" کے مقدمہ میں لکھتا ہے:-

وعلی هذا یبتنی قاعدۃ الاشراق	اور اسی پر نور و ظلمت کا اشراق کا قاعدہ
فی النور والظلمۃ التی کانت طریقۃ	مبنی ہے، جو فارس کے حکماء جاماسب، فرشاد
حکماء الفارس مثل جاماسف و	شور بزرجمہر اور ان کے پیشرووں کا

Marfat.com

وفرشاد شور، وبوزرجمهر   طریقہ تھا۔

ومن قبلھم

بعد میں بھی اس مزعومہ ایرانی حکمت کے ساتھ ایرانیت پسندوں کا اعتنا برقرار رہا مگر پھر سہروردی جیسا کوئی عبقری پیدا نہیں ہوا، متاخرین نے صرف اس کے شرح وتحشیہ ہی پر اکتفا کیا۔ ان میں سب سے اہم قطب الدین شیرازی کی "شرح حکمۃ الاشراق" تھی، نویں صدی میں محقق دوانی اکثر شرح حکمۃ الاشراق کا درس دیا کرتے تھے، انھوں نے سہروردی کی "ہیاکل النور" کی شرح بھی لکھی تھی، بعد میں شرح حکمۃ الاشراق پر جو حواشی لکھے گئے ان میں سب سے اہم ملا صدرا کا حاشیہ تھا۔

بہرحال اس "حکمت اشراق" کی بنیاد کشف وذوق پر تھی، جو نتیجہ ہوتا تھا مجاہدہ وریاضت کا، اور اس کا ثمرہ بتایا جاتا تھا کہ انسان حسب خواہش بدن عنصری چھوڑنے پر قادر ہو جاتا ہے، چنانچہ خود سہروردی نے اپنے مزعوم امام حکیم افلاطن الٰہی کے بارے میں لکھا ہے:-

"وذوات الاصنام من الانوار القاھرۃ شاھدھا المجردون بانسلاخھم عن ھیاکلھم مرارا کثیرۃ ..... وحکی افلاطن عن نفسہ انہ خلع الظلمات وشاھدھا۔"

اسی طریقہ آذر کیوان نے اختیار کیا۔ صاحب دبستان المذاہب نے اس کے ریاضت ومجاہدہ کے بارے میں لکھا ہے:-

"آذرکیوان بازلی تایید ویزدانی نیرو از پنجسالگی کم خوری وشب بیداری پرداخت ..... بست وہشت سال در غم نشست، ہشتاد وپنجسال با عنصری بیکر بود، دست از ریاضت باز نداشت۔"

اس کے کشف وکرامات کے بارے میں مشہور تھا کہ جب اس نے حکمائے یونان وایران

Marfat.com

کی تعلیمات پر مطلع ہونا چاہا تو انھوں نے خود خواب میں آکر اپنا سارا علمی سرمایہ اس کے سپرد کر دیا،
اس لیے اس کا نام ذوالعلوم پڑ گیا۔ "انخلاع جسد عنصری" کی کرامت کے بارے میں اس کے
شاگرد فرزانہ بہرام نے لکھا ہے:۔

"کیوان می فرمود پیوند روان من با جسم تن چون نسبت بدن به پیراہن است کہ ہرگاہ میخواہم
از وی گسلم و چون می خواہم بدو می پیوندم"

اسی طرح اس کے متبعین کے بارے میں ناقابل قیاس کشف و کرامات کی داستانیں مشہور
تھیں، صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"گویند قوت انقطاع این گروہ از عنصری بدن بمرتبہ بود کہ ہرگاہ خواستندے از وی
جدا می شدندے و جمیع علوم مشہورہ و غریبہ را از ملاء اعلیٰ فراگرفتندے"

اور یہ سب افسانے شیخ بو علی سینا کی "الاشارات والتنبیہات" کے آخری انماط کی تعبیر تھے، بہر حال
یہ لوگ محض زردشتی نہ تھے، بلکہ فلسفہ و حکمت کے بھی عالم و ماہر تھے۔ فرزانہ بہرام (آذر کیوان کا جانشین)
محقق دوانی کے شاگرد رشید خواجہ جمال الدین محمود کا شاگرد تھا، اس کی فلسفہ دانی کے بارے
میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"وادمردے بود مراتب منطقیات و طبیعیات و ریاضیات و الٰہیات از پارسی و پہلوی
و تازی انچہ نقل افتادہ کما وجب بسند صحیح فراگرفتہ و نیکو خواندہ و از منقولات و معقولات
بہرہ وافی، و حکمت دانستی و کردنی فرزانہ رسا و فیلسوفے کامل بود"

لیکن اس تحریک کو ایران میں کامیابی نہیں ہوئی اور شاہ عباس نے نقطویوں پر جو سختی
کی تھی اسے دیکھنے کے بعد مجوسیت کے احیاء کے سارے خواب کافور ہو گئے، اس لیے آذر کیوان
اور اس کے تلامذہ ایران سے مایوس ہو گئے، مگر جب ان لوگوں کے علم و فضل اور کشف و کرامات

کے قصے اکبر تک پہنچے تو اس نے بڑے اشتیاق سے آذر کیوان کو ایران سے بلایا، مگر اس نے آنے میں دیر کی، وہ اس وقت ہندوستان پہنچا جب اکبر کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے شاگردوں میں فرزانہ بہرام خورداد، فرزانہ فرشید، موبد ہوشیار، موبد سروش، فرزانہ بہرام کوچک وغیرہ مشہور ہیں، موخر الذکر کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:۔

"مردے بود باخدا آرمیدہ و از خلق رمیدہ بجمیع علوم عقلی و نقلی عالم و بزبان تازی و پارسی و ہندی و فرنگی ماہر و تصانیف شیخ اشراق شہاب الدین مقتول کہ در حکمت اشراقی واقف شدہ بپارسی معروف تازی آمیز ترجمہ کردہ"

ان دل خوش کن تصوں نے دیگر مذاہب کے پیروؤں کو بھی آذر کیوانیوں کا گرویدہ بنا دیا، ان میں سے محمد علی شیرازی، محمد سعید اصفہانی، عاشور بیگ، محمود بیگ تین مسلمان تھے، رام محبت اور راجندر کھتری ہندو تھے، صاحب دبستان المذاہب نے ابوالقاسم قندرسکی کو بھی آذر کیوانیوں کا خوشہ چیں لکھا ہے، تعجب ہے کہ وہ شیخ بہاء الدین عاملی جیسے متورع و متشرع عالم کو بھی آذر کیوانیوں کے ارادت مندوں میں بتاتا ہے:۔

"شیخ بہاء الدین محمد عاملی کہ از
می گرفت و جویائے شاگردان و ذا
غرض صفوی انقلاب کی قوم پرستی۔
عجیب بیراہ روی پیدا کر دی تھی، چنانچہ ا
(سپاسیاں) کے علاوہ جو دو اور فرقے تھے جز
مذہب کے صوفی تھے، اور باقی میں سے بیشتر قدیم فلـ
"جمشاسپیاں" کا نام اختیار کر لیا تھا، اور سوفسطـ

آخری درجہ فرد مندیہ کا تھا، جو باری تعالیٰ کو بھی موہوم سمجھتا تھا، نعوذ باللہ منہا۔ "عذائیان" گویا صابئیت کا دوسرا نام تھا۔ "زادیان" قدیم (Mithraism) کا احیا تھا، یہ آفتاب کی پرستش کرتے تھے، قدیم یونانی فکر کا منتہائے مقصود کائنات کے مبدء اولین کی تلاش تھا، تامیس پانی کو، انکسمینیس ہوا کو اور ایراقلیطس آگ کو جوہر اولین بتاتے تھے، جن سے کائنات وجود میں آئی ہے، لیکن کسی نے خاک کو مبدء اولین نہیں کہا تھا، مگر اس وقت مجوسیوں میں چاروں عناصر کے پرستار موجود تھے، "شیدائیان" (خاک پرست)، "الدریان" (آب پرست)، "پیکریان" (آتش پرست)، "میلانیان" (ہوا پرست) اصحاب الطبائع "شید رنگیان" تھے، اور ہیولیٰ پرست "آختیان"۔ مزدک کے پیرووں نے بھی اپنے مذہب کا احیا کرنا چاہا، مگر یہ لوگ مسلمانوں کے لباس میں رہتے تھے،

مگر ان تمام تحریکوں کو ایران میں ناکامی ہوئی، شاہ عباس صفوی کا خوف ہی ایسا غالب تھا اس لیے یہ لوگ ہندوستان چلے آئے، اور عہد اکبری کے تفلسف زدہ اور اسلام بیزار دربار نے ان کی ہر طرح ہمت افزائی کی، اکبری نام نہاد دینِ الٰہی نے دو شکلیں اختیار کیں: اسلام بیزاری اور فلسفہ پسندی، پہلی شکل کی توضیح ہمارے موضوع سے خارج ہے، دوسری شکل کے بارے میں صاحب دبستان المذاہب نے لکھا ہے:-

"حکم شد کہ الہیین از علوم غیر نجوم وحساب وطب وفلسفہ نخوانند وعمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست صرف نکنند"

اگرچہ یہ حکم ناطق صرف خوشامدی درباریوں (الہیین) کے لیے تھا، مگر اس کا اثر معاشرہ پر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔

"وشنیدن مناظرۂ علماء در میان مردم بالطبع خواندن تفسیر وفقہ برطرف شد ونجوم وحکمت وحساب وتصوف وشعر وتاریخ مقرر گشت۔"

Marfat.com

فیضی کا ایک بڑا شاندار کتب خانہ تھا، مگر اسکی وفات پر یہ شاہی خزانہ میں داخل کیا گیا تو علوم شرعیہ کی کتابوں کو ادنیٰ درجہ میں رکھا گیا، بدایونی نے لکھا ہے:-

"در وقت گزرانیدن کتب از نظر طومار را سہ قسم ساختند اعلیٰ نظم وطب نجوم وموسیقی را قرار دادند واوسط حکمت وتصوف وہیئت وہندسہ وادنیٰ تفسیر وحدیث وفقہ وسائر شرعیات"

الحاد پسند شعراء کے علاوہ حکمت ومعقولات کے فضلا بھی قدردانی کی تلاش میں ایران سے ہندوستان آئے، ان میں ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمام، قاضی محمد یزدی، میر مرتضیٰ شریفی زیادہ مشہور ہیں، امیر فتح اللہ شیرازی دکن سے گجرات ہوتے ہوئے آئے، ان کے علاوہ اور علماء دیگر اطراف سے ہند میں تشریف لائے، جیسے شیخ حسین بغدادی، میرک عبدالباقی، مولانا عبدالخالق گیلانی نیز مولانا نجم الدین تستری۔

۱۱- گیارہویں صدی کے ایرانی فضلا میں شیخ بہاءالدین عاملی اور میر باقر داماد مشہور ہیں، شیخ بہاءالدین عاملی شیعی دینیات کے فاضل اجل ہونے کے علاوہ ریاضی وہیئت پر بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے، فن حساب میں "خلاصۃ الحساب" اور ہیئت میں "تشریح الافلاک" ان کی تصانیف میں بہت زیادہ مشہور ہوئے، اور ان دونوں کتابوں کو قدرت نے غیر معمولی مقبولیت بخشی، یہ دونوں رسالے ہندوستان میں داخل درس ہوئے، اور اکثر علما نے ان کے ساتھ شرح وتحشیہ کے ساتھ اعتنا کیا۔

مگر زیادہ شہرت میر باقر داماد کو ہوئی، وہ فلسفہ میں سرآمد فضلائے روزگار تھے، کلام میں "صراط مستقیم" اور فلسفہ میں "الافق المبین" ان کی مشہور تصانیف ہیں، ان کے علاوہ انھوں نے اور بھی کتابیں فلسفہ میں لکھیں جیسے "قبسات" وغیرہ۔

ہندوستان کے بہت سے فضلا میر باقر داماد سے پڑھ کر آئے تھے، وہ تو ان کے عقیدتمند

تھے ہی لیکن یہاں جو ان کے ہم پیشہ حریف تھے، وہ بھی ان کے علم و فضل اور دین و دیانت کے معترف تھے، قرون وسطیٰ کے ہندوستان کا واحد فلسفی ملا محمود جونپوری کو سمجھا جاتا ہے، مگر جب وہ میر باقر داماد کا ذکر کرتے ہیں تو "الحاذق البالغ الفائق السمیدع بطول الباع وعلو الکعب فی معظم اصول الفلسفۃ" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اور ان کی فلسفیانہ تفکیر کی تفصیل "توغلہ فی سیاحۃ ارض الحقیقۃ وتورطہ فی سیاحۃ یم الحکمۃ وولوجہ فی اعماق ثری الملک باقدام النظارۃ الغائرۃ وعروجہ عن اطباق سماء الملکوت بقوادم انکارۃ السافرۃ" کے عنوان سے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ میر باقر داماد اپنے وقت کے عبقری اعظم تھے، انھوں نے فلسفۂ عاصر الوقت کی ثروت میں نئے نئے نظریات وتصورات کا اضافہ کیا۔ ان میں سب سے اہم "حدوث دہری" کا مسئلہ ہے۔ فلاسفہ کی تقلید میں وہ حدوث زمانی کے منکر تھے لیکن تعلیماتِ اسلامی کا تقاضا تھا کہ وہ "حدوث عالم" کی تائید کریں، اور فلاسفہ کے "حدوث ذاتی" پر (جو قدم عالم کا دوسرا نام ہے) قناعت نہ کریں، اس لیے انھوں نے قدمِ زمان اور حدوثِ عالم کے مابین مفاہمت کی کوشش کی، وہ ہرچند کہ امام رازی سے ناراض ہیں کہ انھوں نے فلاسفہ کی "زمان دہر" اور سرمد کی تدقیق کو "تہویلات خال عن التحصیل" سے تعبیر کیا ہے، پھر بھی ان کی ملی وخاندانی غیرت خود کو "قدم عالم" کے عقیدے کے ساتھ راضی نہیں کر سکی۔ اس لیے انھوں نے "حدوث دہری" کا نظریہ تراشا۔ ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں لکھا ہے:۔

> واعلم ان بعض خیرۃ اللاحقین بالمہرۃ السابقین مع توغلہ فی سیاحۃ ارض الحقیقۃ وتورطہ فی سیاحۃ یم الحکمۃ وولوجہ فی اعماق ثری الملک باقدام النظارۃ الغائرۃ وعروجہ عن اطبـ

سماء الملکوت بقوادم افکاره السافرة اذ نبض عرقه الهاشمی لحمایة دمار الظاهر من الدین والذب عن حمی ما علیه الجمهور من الملیین من حدوث العالم بقضه وقضیضه لا حدوثا ذاتیا فقط من جهة لحاظ الذات فحسب بل حدوثا احسن من ذلک مسبوقا بسلب الوجود اصلا فی الاعیان قبل صدق الایجاب لم ترخصه بصیرته النقادة وقریحته الوقادة ان یقول بالحدوث الزمانی للزمان ...... ابتدع القول بالحدوث الدھری والقبلیة الدھریة وقنن فی ذلک القوانین الدقیقه ودون الصحف الانیقة"

ہندوستان کے علمی حلقوں میں بھی اس مسئلہ کا رد و قبول دونوں ہی طرح استقبال کیا گیا، ان کے شاگرد اور عقیدت مند اس نئے انکشاف کو سراہتے تھے، مگر مخالفوں میں بھی صف اول کے علما ان کے دو گروہ تھے، تفلسف پسند حضرات جن کے گل سرسبد ملا محمود جونپوری تھے، جو حدوث دہری کے منکر اور قدیم ابن سینائی قدم زمانی کے قائل تھے تا آنکہ بارھویں صدی میں ملا امان اللہ بنارسی نے دونوں فاضلوں (میرباقرداماد اور ملا محمود جونپوری) کے مابین محاکمہ کیا۔

"نظریہ حدوث دہری" کے منکرین کی دوسری جماعت متکلمین کی بھی تھی، وہ "قدم زمان" کے ساتھ "معیت دہریہ" کو بھی انکار کرتے تھے۔ اس جماعت کے سرگروہ خاتم المتکلمین مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جنھوں نے میرباقرداماد کے "الافق المبین" پر حاشیہ لکھا ہے۔ ان کے کتب نگر نے وجود ان کے ابطال پر اپنی توجہ خصوصیت سے مرکوز کر دی تھی، اور ان کے اس اعتنائے مفرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار مولانا عبدالحق خیرآبادی کو اعتراف کرنا پڑا۔

" نعم وجود الزمان ینبغه ان یکون اضعف انحاء الوجود دباجمانہ

Marfat.com

ان اريد بنفي وجوده نفي وجوده على سبيل التحصيل كان ذالك

حقا لانه ليس له البتة وجود كذالك في الاعيان"

ب۔ اس وقت ایران میں شاہ عباس صفوی کی سخت گیری کے باوجود فلسفہ کی نشأۃ ثانیہ

ہو رہی تھی، اور پھر فارابی اور ابن سینا کی عظمت و احترام کی طرف طبیعتیں مائل تھیں، امام غزالی

نے "تہافت الفلاسفہ" میں فارابی و ابن سینا کی بالواسطہ تکفیر کی تھی، اور حسب ذیل عقائد کو

کافرانہ بتایا تھا: قدم عالم، باری تعالیٰ کے علم بجزئیات حادثہ کا انکار اور معاد جسمانی کا انکار۔

اس لیے فلسفہ کے نشأۃ ثانیہ کے ساتھ ایران میں ان مسائل کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔ اور لوگ

امام غزالی کی عظمت فکر کے باوجود ان کے اس تکفیری موقف کے ساتھ اتفاق کرنے سے

قاصر پاتے تھے۔

گیارھویں صدی کے وسط میں یہ ماحول تھا کہ ۱۰۵۶ھ میں شاہجہاں نے جان سپار خاں کو

سفیر بنا کر ایران بھیجا۔ اس سفارتی وفد کے عملہ میں محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس تھے،

ان دونوں کو اپنی معقولات دانی کا غرہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ سلطان سے جو اعلم علمائے عراق تھے،

الجھ پڑے، خلیفہ سلطان نے وقت کی اس اہم بحث کے سلسلے میں پوچھا کہ امام غزالی نے جو مسائل

ثلثہ میں فارابی و ابن سینا کی تکفیر کی ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ محمد فاروق اور محب علی

کوئی شافی جواب نہ دے سکے، چنانچہ وزیر سعد اللہ خاں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے نام جو

مکتوب بھیجا تھا۔ اس میں لکھا ہے :-

اذ افراد وقائع ایران زمین بسامع حقایق مجامع رسید کہ افادت پناہ و افاضت

دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر دانش در عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است اذ محمد فاروق

مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ با مارت آب جان سپار خاں سفیر متعین اند اپس از

Marfat.com

دعواے ایشان بفضل وکمال رسیده باشد کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم ونفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جل امرہ بجزئیات مادیہ حادثہ ونفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی وشیخ ابوعلی سینا نموده وجہے تاویل کلام حکما نکرده اند، این مراتب را تقریر باید کرد، مدعیان دروغ چون شمع کشتہ بے فروغ مانند۔"

بہرحال جب شاہجہاں کو اس کی اطلاع ملی تو بڑا صدمہ ہوا، اور اس کے ایما سے وزیر سعد اللہ خاں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی سے موضوع زیر بحث پر ایک سیر حاصل بحث لکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ سعد اللہ خاں نے اپنے محولہ بالا مکتوب میں آگے چل کر لکھا ہے :-

"لہذا کمترین مریداں حکم شد کہ آں فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند بر نگارد و بر گزارد کہ آں افادت وافاضت مرتبہ، دریں مسائل مختصرے جامع وموجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکما، وتاویلات علما، وجہ تکفیر اسلامیین واقوال ملیین ومباحث ومناظرات وشکوک وشبہات وازالات وازاحات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت تحقیقات در اصل کلام در ہر باب واساس سخن در ہر جواب وانچہ بداں ظفر یافتہ باشند وبرہان کہ بداں فائز شده باشند واحاطہ مسائل متعلقہ بایں مطلب علمی از حضوری وحصولی وبودن علم عین عالم وعین معلوم یا عتراف تعلق بجزئیات بر وجہ کلی است یا جزئی وتحریر آنکہ جزئیت وکلیت مفہوم تابع مدرک است یا تابع مدرک ویا واجب جزئی ہست یا نہ۔ وبیان آنکہ ادراک تعلقے است واضافے نیست وشمول علم بغیبات ومشخصات از زمان وغیر آں وتبدل علم بمعلوم یا تبدل زمان وحضور زمان بجمیع اجزاء من ازل الآزال الی ابد الآباد وحرکت غیر قارة چنانکہ باشد نوشتہ در حضرت خلافت در عرض دہ یازده روز باید فرستاد کہ بایران فرستاده شود وآنچناں باید بود کہ قابل فرستادن باشد ولائق اضافہ بآں فضائل دستگاہ بود

وہ روزگار ازاں ارگویند در تاریخ نامہ ا نوشتہ شود۔"

اس استدعا کے نتیجے میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے اپنا مشہور رسالہ "الدرالثمینہ" تصنیف کیا،

اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :۔

"یقول العبد المسکین عبدالحکیم ابن شمس الدین ہذہ قواعد عالیۃ

وفوائد غالیۃ نظمتہا القلوب ہادیۃ وآذان واعیۃ بامر الملک المقام

..... ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب القرآن الثانی ....

اللہم کما فضلتہ بالسلطنۃ الکبری فی الدنیا متعمد بالسعادۃ العظمی فی العقبی۔"

یہ رسالہ حسب درخواست سعد اللہ خاں وزیر تین مباحث پر مشتمل ہے: علم باری جسم جسمانی وروحانی

اور قدم وحدوث عالم لیکن ان میں زیادہ اہم علم باری کا مسئلہ ہے۔ اور رسالہ کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے۔

اس میں تین بحثیں ہیں جیسا کہ علامہ نے لکھا ہے :۔

"الاول فی علمہ تعالیٰ وفیہ ابحاث: الاول فی اثباتہ ..... البحث الثانی فی ان

علمہ ما ہو وکیف ہو..... البحث الثالث فی عموم علمہ تعالیٰ۔"

اس کے بعد "علم باری" کا مسئلہ علمی حلقوں میں گرمی محفل کا سامان بن گیا۔ اکثر علمائے امداد نے اس پر طبع آزمائی

کی۔ اسی رجحان سے متاثر ہو کر ملا محب اللہ بہاری نے "سلم" میں لکھا "سبحانہ ما اعظم شانہ لا یحمل

ولا یتصور" اور اس طرح یہ مسئلہ شرح "سلم العلوم" کی کاوش تحقیق، موضوع بن گیا، ہر شارح اور محشی

نے دل کھول کر اسکی داد تحقیق دی۔ بعد میں بعض علماء نے اس موضوع (مسئلہ علم باری نیز مسئلہ علم) پر مستقل

رسائل لکھے۔ اس قسم کے کچھ رسالے اسٹیٹ لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔

مگر یہ سب کچھ ایران کی علمی بحثوں اور وہاں کے علمی رجحانات کا تسلسل تھا۔ جو ہندوستانی فکر میں اس

طور سے منعکس ہو رہا تھا،

Marfat.com

ج۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی علمائے ایران ہندوستان آتے رہے۔ ان میں شیخ ابوتراب شیرازی، سید تقی الدین شیرازی، شیخ جمال الدین شیرازی، شیخ تقی الدین تستری، سلطان حسین یزدی، ملا فرخ ہروی، مولانا کمال الدین نیشاپوری، حکیم محمد معصوم تستری، میر محمد ہاشم گیلانی، ملا رشید شیرازی زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ براہ راست دربار شاہی میں آکر ملازم ہوئے، بعض گجرات رہ گئے بعض دکن چلے گئے۔

ان میں سے اکثر فضلاء نے علمائے ہند کے مناظرے بھی رہے، ملا شفیعا اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا مناظرہ مشہور ہے۔ امام الدین الریاضی نے لکھا ہے:

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ از ولایت آمدہ بود و خطاب دانشمند خاں یافتہ بود طلبید۔ ایشاں آمدند و اجلاس علما و فضلا و حکما حکم شد۔ چوں نوبت سخن بمولوی عبدالحکیم رسید و با دانشمند خاں مباحثہ واقع شد بر مراد ایاک نعبد و ایاک نستعین گفتگو بطول کشید و بالآخر درستی قول مولوی و راستی سخن ایشاں بر پادشاہ و سائر امرا و علمائے عالی شان در ظہور آمد۔"

د۔ شاہجہاں کی سیاسی فتوحات کے نتیجے میں بلخ بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا اور یہاں کے علما بھی ہندوستان پہنچے۔ ان میں سب سے مشہور مولانا عوض وجیہ بلخی تھے۔ ایک مرتبہ لاہور تشریف لائے، اور علامہ عبدالحکیم کے درس میں بھی گئے مگر سپاہیانہ وضع میں تھے۔ اسلیے کوئی پہچان نہ سکا۔ اثنائے درس میں علامہ کی تقریر پر جو ایرادات کرنا شروع کیے تو علامہ سے جواب دیتے نہ بنا۔ کچھ دن بعد سعد اللہ خاں سے ملاقات ہوئی اور یہ قصہ سنایا، سعد اللہ خاں سمجھ گئے کہ وہ مولانا عوض وجیہ تھے، جب علامہ کو معلوم ہوا تو بے اختیار شعر پڑھنے لگے

"از آمدنش اگر خبر داشتمے در رہ گذرش گل و سمن کاشتمے"

۱۲۔ اس مختصر جائزے میں ایران کے ان شعراء سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جو قدردانی کی تلاش میں ہندوستان آئے۔ مغل عہد تو ان نووارد ایرانی شعرا کے ورود کیلیے مشہور ہے۔

Marfat.com

مگر یہ سلسلہ مغل عہد کے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا، آخری زمانہ میں شیخ علی حزیں تشریف لائے، مگر ہمارے یہاں بدقسمتی سے وہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں، اور ہم ان کے کمال کی اس سے زیادہ داد نہ دے سکے کہ

صید از حرم کشند خم جعد بلند تو — فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

ان کی فکر کا زائیدہ تھا۔ حالانکہ وہ شاعر سے زیادہ عالم اور معقولی تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں مندرجہ ذیل کتابیں اپنی تصانیف بتائی ہیں، جو فلسفہ و حکمت کی مطولات سے متعلق ہیں: شرح رسالہ کلمۃ التصوف شیخ اشراق، رسالہ ابطال تناسخ برائے طبیعیین، رسالہ کنہ المرام در قضا و قدر، حاشیہ بر الہیات شفا، حاشیہ بر امور عامہ شرح تجرید، حواشی بر شرح حکمت اشراق، حاشیہ بر شرح ہیاکل النور، رسالہ تجرد نفس، رسالہ لوامع مشرقیہ در تحقیق معنی واحد و وحدت، رسالہ موسومہ بہ توفیق در توافق حکمۃ و شریعہ، رسالہ توجیہ کلام قدماء حکمائے مجوس در مبدء عالم

یہ مختصر تذکرہ ہے، ہند و ایران کے علمی و ثقافتی روابط کا جس کا آغاز عہد اسلام سے ہوتا ہے اور خاتمہ شیخ علی حزیں کی آمد پر۔ یہ ایک ہی ثقافت کے دو علمبردار ملکوں کا اختلاط تھا جسے ایران میں وقتاً فوقتاً کسی نئے عبقری کا ظہور زیادہ نمایاں کر دیتا تھا، بہرحال یہ ایک حقیقت ہے، مگر جب ہم متکلف "انڈو ایرانین کلچرل ریلیشنز" کی تجدید کرتے ہیں، تو اپنی ادعائی تحقیق و کاوش کی نمایش کے لیے خواہی نخواہی اس درخشندہ و تابندہ حقیقت پر تکلفات کے پردے ڈالنے کی کوشش کیا کرتے ہیں، مگر ہمارا یہ تکلف آخرکار مضحکہ خیز ہی ثابت ہوتا ہے۔

(معارف: مارچ ۱۹۶۳ء)

(۴)

ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کا آغاز ساتویں صدی عیسوی | نویں صدی سے پہلے معقولات کی گرم بازاری
سے ہوتا ہے، جب کہ عرب فاتحین اس ملک میں پہلی مرتبہ داخل ہوئے، اور خاتمہ ۱۸۵۷ء میں سمجھنا چاہیے،
جب کہ برطانوی استعمار نے مغل سلطنت کے کھنڈروں پر انگریزی حکومت قائم کی، اس طویل مدت کو
تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:۔

۱۔ عرب حکومت: ۱۵ھ سے ۴۱۷ھ تک

۲۔ ترک و افغان حکومت: ۳۶۷ھ سے ۹۳۲ھ تک

۳۔ مغل حکومت: ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک

ذیل میں صرف پہلے دو ادوار کی علمی سرگرمیوں کا ایک مختصر تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے:

(۱) عرب حکومت

عرب حکومت کو تین ذیلی ادوار میں مزید تقسیم کیا جا سکتا ہے

Marfat.com

۱۔ عرب فاتحین کی آمد اور سرحدی جھڑپیں ۱۵ھ۔ ۹۳ھ	حسب تصریح البلاذری ۱۵ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن ابی العاص کو بحرین اور عمان کا گورنر بنا کر بھیجا، انھوں نے

عمان پہنچ کر ایک بحری مہم بمبئی کے قدیم بندرگاہ تھانہ کی طرف روانہ کی، کچھ دن بعد ایک اور مہم بھڑوچ اور دوسری دیبل کی طرف بھیجی گئی، یہ سب مہمیں کامیاب لوٹیں لیکن حضرت عمرؓ دور دراز علاقوں کی فتوحات کو پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے کچھ عرصہ کے لیے سمندر کی جانب سے ہندوستان پر حملہ کا خیال ختم ہو گیا،[1]

مگر اسی عرصہ میں ایران کی عظیم الشان سلطنت عربوں کے قبضہ میں آگئی، اور قلمرو ے خلافت کی سرحدیں برصغیر کی شمالی مغربی حدود سے متصل ہو گئیں، اس طرح سرحدی جھڑپوں کا ہونا ناگزیر ہو گیا، چنانچہ ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ بلوچستان فتح کرتے ہوئے لاہور اور بنوں تک پہنچ گئے،[2]

اس کے بعد بھی سرحدی آویزشوں کا سلسلہ باقی رہا، مگر ان کی نوعیت ہنگامی یورشوں کی سی تھی، کیونکہ اموی خلفا بھی دور دراز علاقوں پر قبضہ کر کے قلمرو ے خلافت میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے، یہ صورت حال ۹۳ھ تک باقی رہی،

اس وقت تک تو عربوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع ملا تھا، اور نہ وہ خود علوم حکمیہ سے واقف ہوئے تھے، اس لیے اس ذیلی دور میں کسی علمی کاوش کی تلاش بیکار ہے، اگرچہ سندھ کے جو لوگ موالی کے زمرے میں قلمرو ے خلافت پہنچے انکی اولاد جلد ہی علم و فضل کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے لگی، ان میں سب سے اہم عمرو بن عبید ہے جس کا دادا سندی الاصل تھا، اور کابل کے جنگی قیدیوں کے زمرے میں عراق پہنچا تھا، مسعودی لکھتا ہے :-

وهو عمرو بن عبيد بن رباب	وہ عمرو بن عبید بن رباب ہے جو بنی تمیم کا
مولی بنی تمیم وكان جده	مولیٰ تھا، اس کا دادا باب سندی لوگوں

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۸ [2] ایضاً ص ۴۳۸ - ۴۳۹

Marfat.com

رباب من سبی کابل من رجال	میں سے تھا اور کابل کے جنگی قیدیوں میں
السند۔ وکان شیخ المعتزلۃ و	آیا تھا۔ عمرو بن عبید معتزلہ کا پیشوا اور
مفتیھا ولہ خطب ورسائل[1]	مفتی تھا۔ اس نے بہت سے خطبے اور رسالے لکھے تھے۔

عمرو بن عبید معتزلی علم کلام کے بانی واصل بن عطا کا دست راست اور معتزلہ کے فرقہ عمریہ کا بانی تھا[2]۔ اس طرح علم کلام کی بنیاد ایک سندی الاصل فاضل کی رہین منت ہے۔

ب۔ عرب نوآبادی (۹۳ھ - ۳۷۴ھ) امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد عرب و ہند کے درمیان ایک اعصابی جنگ چھڑی جس نے ۹۳ھ میں ایک فیصلہ کن لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ ہوا یہ کہ دیول کے میدوں نے ایک جہاز کو لوٹ لیا جس میں کچھ عرب خواتین بھی سوار تھیں۔ حجاج نے سندھ کے حکمراں[3] راجہ داہر سے قیدی خواتین کی واپسی کی درخواست کی، مگر راجہ نے ایک ٹالنے والا جواب دیا۔ مجبور ہو کر اس نے خلیفہ سے لڑائی کی اجازت لی اور اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے ۹۳ھ میں سندھ کو اور دو سال بعد ملتان کو فتح کر لیا۔ مگر اتنے میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور نئے خلیفہ نے محمد بن قاسم کو معزول کر دیا۔ اس کے جانشین زیادہ قابل نہ تھے۔ اس طرح عربوں کی فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ البتہ برصغیر کا شمالی مغربی حصہ ان کے قبضہ میں آگیا۔

سنہ ۱۱۱ھ تک سندھ اور ملتان کا ایک ہی والی ہوتا تھا۔ اس کے بعد ملتان کا علاقہ سندھ کی بالادستی سے علیحدہ ہو گیا، جہاں سنہ ۳۰۳ھ تک بنو منبہ کی حکومت رہی۔

سنہ ۱۳۲ھ میں اموی خلافت کے زوال پر عباسی خلافت قائم ہوئی اور سندھ بھی نئی خلافت کا ایک صوبہ بن گیا، مگر کچھ عرصہ بعد یہاں کے عرب خاندانوں میں قبائلی عصبیت نے خانہ جنگی کی شکل

[1] مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد ثامن ص ۹۰ [2] الفرق بین الفرق [3] فتوح البلدان ص ۴۴۱

Marfat.com

اختیار کر لی، جو گورنر بھیجا گیا ناکام ہوا، آخر متوکل نے ایک مقامی امیر عمر بن عبدالعزیز الہباری کو ۲۴۰ھ میں سندھ کا نیم مختار حاکم تسلیم کر لیا،

عرب اپنے ساتھ اپنا دین اور کلچر بھی لائے تھے، اور ملک نے بڑی تیزی سے نئے ثقافتی رنگ کو قبول کیا، چنانچہ جن لوگوں نے اسلامی علوم کی ترقی میں حصہ لیا ہے ان کی صف اول میں سندھیوں کا نام نمایاں نظر آتا ہے، جیسے حدیث میں ابو معشر نجیح، فقہ میں امام اوزاعی[۱]، کلام میں عمرو بن عبید[۲]، شاعری میں ابو عطاء السندی،

لیکن سرزمین ہند کے یہ ستارے باہر ہی جا کر چمکے اور سندھ کے اندر نوادر فضلا ہی کا تذکرہ ملتا ہے، جیسے قاضی موسیٰ بن یعقوب الثقفی جنھیں محمد بن قاسم نے قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا، دوسرا نام ربیع ابن صبیح کا ہے جو بعض علما کے نزدیک عربی ادب کے پہلے مصنف ہیں، وہ بھی سندھ ہی میں دفن ہیں[۳]،

جہاں تک فلسفہ و حکمت کا تعلق ہے، ابھی بغداد میں اس کی تشکیل ہو رہی تھی، اور اس کے لیے یونان اور دیگر قدیم ممالک کے علمی سرمایہ کو عربی میں منتقل کیا جا رہا تھا، اس میں ہندوستان کے حکمی ادب کا بھی خاص حصہ ہے،

چنانچہ ۱۵۶ھ (یا بقول البیرونی ۱۵۴ھ[۴]) میں ہندوستان کا ایک علمی وفد منصور کے دربار میں پہنچا، اور دیگر علمی تحائف کے ساتھ "برہم سدھانت" کا ایک نسخہ بھی اسکی خدمت میں پیش کیا، منصور نے منجمین دربار میں سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق کو اسے عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا[۵]، اسی ترجمہ پر جو عرصہ تک "السند ہند" کے نام سے موسوم رہا، عربی علم الہیئۃ کی بنیاد رکھی گئی، مامون الرشید کے عہد میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے "المجسطی" اور "زیج شہریار"

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۶۱ [۲] مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد ثامن ص ۹۰
[۳] سبحۃ المرجان [۴] کتاب الہند ص ۲۰۸ [۵] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۴۹،

کی مدد سے اس پر نظر ثانی کرکے اپنی "زیج الخوارزمی" مرتب کی، جو عرصہ تک مسلم ہیئت دانوں کا معمول بہ رہی۔[1] خوارزمی کے علاوہ اور ہیئت دانوں نے بھی السندہند کے ساتھ اعتنا کیا۔ جیسے حبش الحاسب، عبداللہ بن اماجور، حسن بن المصباح، حسین بن محمد الآدمی، فضل بن حاتم التبریزی، محمد بن اسحاق السرخسی، البیرونی، ابن السمح، ابن الصفار وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہندوستانی علم الحساب (حساب الہند) بھی عربوں میں پہنچا اور اس کے ضمن میں مسلمان ریاضی داں "طریق ترقیم اعداد (الارقام الہندیہ) سے واقف ہوئے جو بعد میں یورپ پہنچ کر ("Arab Numerals") کے نام سے موسوم ہوا۔

اسی طرح ہندوستانی اطبا نے جاکر دارالخلافہ میں ہندوستانی طب کا نام بلند کیا، منکہ نے ہارون الرشید کے لاعلاج مرض کو اچھا کیا۔[2] اور صالح بن بہلہ نے اس کے چچازاد بھائی ابراہیم کو جو بظاہر مرچکا تھا، تندرست کیا۔[3] منکہ اور ابن دھن نے آیورویدک کی بہت سی کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے، جن کی تفصیل ابن الندیم نے الفہرست میں دی ہے۔[4] مسلمان اطبا نے ان تراجم سے بہت زیادہ استفادہ کیا، چنانچہ علی بن ابن الطبری جس نے متوکل کے عہد میں اپنی مشہور کتاب "فردوس الحکمۃ" کو لکھا تھا، اس کے آخری باب میں ہندوطب کا خلاصہ بیان کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے شاگرد ابوبکر زکریا الرازی نے بقول ابن ابی اصیبعہ "کتاب الحاوی" میں اکثر ہندوستانی اطبا کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔[5]

ہندوستانی فلسفہ نے بھی علم کلام اور نام نہاد اسلامی فلسفہ کو متاثر کیا۔ "آفادۂ نظر کا انکار" (Empiricism) (بدھ منکرین) سے اسلامی فکر میں پہنچا۔ "جزو لایتجزی"

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء، لابن القفطی ص ۱۸۷ [2] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، لابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۳۳

[3] ایضاً ص ۳۴-۳۵ [4] الفہرست لابن الندیم ص ۲۴۵ [5] ابن ابی اصیبعہ جلد ثانی ص ۳۲ [6] شرح المواقف

Marfat.com

کا تصور جس کے انکار پر ابن سینا نے طبعیات کی بنیاد قائم کی، بودھ اور چینی فلاسفہ کا ماخوذ ہے[۱]،
اور ہندوستانی علم و حکمت کے جس سرمایہ سے استفادہ کیا، اس کے لیے وہ اسی خطۂ ملک کے
رہین منت تھے، جہاں ان کی حکومت تھی، اور جو "اسلامی ہند" کا مصداق تھا،

ج۔ ہندوستان کی نیم آزاد عرب حکومت ۲۴۰ھ -۴۱۶ھ

۲۴۰ھ میں متوکل نے عمر بن عبد العزیز الہباری کو سندھ کا نیم خود مختار حاکم تسلیم کیا تھا، اس کے بعد ۲۷۰ھ میں اس کا بیٹا عبد اللہ بن عمر
تخت نشین ہوا جس نے تقریباً تیس سال حکومت کی، اس کے زمانہ میں بقول بزرگ بن شہریار سندھی
زبان کے اندر اسلامی تعلیمات پر سب سے پہلے کتاب لکھی گئی[۲]، اور اس طرح اردو زبان کی نیز عقائد
اسلام کی سب سے پہلی تصنیف ظہور میں آئی، عبد اللہ بن عمر کا جانشین عمر بن عبد اللہ الہباری ہوا، جو
بڑا قابل اور مدبر تھا، مگر اس کے بعد یہ خاندان کمزور ہوتا گیا، اور اکثر علاقے حکومت سے نکل گئے، پھر بھی
۳۷۵ھ کے بعد تک سندھ میں ہباریوں کی حکومت رہی، کیونکہ مقدسی نے اس سال یہاں انہیں کو
حکمراں پایا تھا، غالباً چوتھی صدی کے آخر میں یہاں اسماعیلی قابض ہو گئے جن کے آخری حکمراں
خفیف کو محمود نے ۴۱۶ھ میں ختم کر کے سندھ کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا،

ملتان میں بنو سامہ کی حکومت تقریباً ۳۷۲ھ تک رہی، کیونکہ ابن حوقل جو ۳۶۷ھ
میں ملتان آیا تھا، یہاں سنی حکومت ہی کا ذکر کرتا ہے، مگر جب مقدسی ۳۷۵ھ میں یہاں آیا،
تو ملکی مذہب شیعیت کو پایا، نیز عضد الدولہ بویہی کی وفات پر مشرق میں اسماعیلی پروپگنڈا تیز ہو گیا،
تھا[۳]، اور اس کے نتیجہ میں حلم بن شیبان نے ملتان میں قرمطی (اسماعیلی) حکومت قائم کی جسے ۴۰۴ھ
میں محمود غزنوی نے ختم کیا، مگر قرمطیت یہاں سے دور نہ ہو سکی تفصیل آگے آ رہی ہے،
اس طرح عربوں کے زیر اثر حکومت ہندوستان میں اسلامی ثقافت کے دو گہوارے تھے،

---

[۱] مذہب الذرہ عند المسلمین [۲] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۳ [۳] الفرق بین الفرق ص ۲۷۶

Marfat.com

ایک سندھ میں اور دوسری ملتان میں، ابن حوقل ملتان کے بارے میں جہاں وہ ۳۶۷ھ میں آیا تھا، لکھتا ہے:-

وفی اهلها رغبة فی القرآن	ملتان کے باشندوں کو قرآن اور تفسیر نیز قرأت
وعلمه والاخذ بالقاری لسبعة	سبعہ اور فقہ سے رغبت ہے، اور ادب
والفقه وطلبة الادب العلم[1]	اور علم کا شوق ہے،

اسی طرح مقدسی جو سندھ میں ۳۷۵ھ میں آیا تھا، یہاں کی علمی حالت کے بارے میں لکھتا ہے:

المنصورة هی قصبة السند	منصورہ سندھ کا دار الحکومت ہے، یہاں کے
..... لهم مروءة وللاسلام	باشندوں میں مروت ہے، اور اسلام
عندهم طراوة والعلم و	کے لیے تر و تازگی ہے، یہاں علم اور
اهله كثير[2]	علما کی کثرت ہے،

سندھ میں عام طور پر علم حدیث کا بہت زیادہ چرچا تھا، مشاہیر علما میں مقدسی قاضی ابو محمد منصوری کا ذکر کرتا ہے، جو داؤدی المذہب تھے، اور خود درس حدیث دیتے تھے،

اكثرهم اهل الحديث ورأيت	یہاں کے اکثر باشندے اہل حدیث ہیں، میں نے
القاضی ابا محمد المنصوری	یہاں قاضی ابو محمد منصوری کو دیکھا جو
داؤديا اماما فی مذهبه	داؤدی مذہب کے امام ہیں، وہ درس دیتے
وله تدريس وتصانيف	ہیں اور ان کا ذاتی مدرسہ بھی ہے، اور تصنیف
قد صنف كتبا حسنة[3]	وتالیف میں بھی مشغول رہتے ہیں، بہت سی عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

سندھ کے شہروں میں دیول اور منصورہ بہت زیادہ مردم خیز تھے، دیول (دیبل) ایک

---

[1] صورۃ الارض لابن حوقل ص ۳۲۲ [2] احسن التقاسیم للمقدسی ص ۴۷۹ [3] ایضاً ص ۴۸۱

Marfat.com

قدیم ساحلی شہر تھا جسے محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں فتح کیا تھا، یہاں کے علما میں سے مندرجہ ذیل حضرات کا تذکرہ تاریخ و تراجم کی کتابوں نے محفوظ رکھا ہے: ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابو العباس احمد بن عبد اللہ ابن سعید الدیبلی، ابراہیم بن محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد بن شعیب بن بزیع بن سوار (ابن قطعان) الدیبلی، علی بن موسی الدیبلی، خلف بن محمد الموازی الدیبلی، ابو العباس محمد بن محمد بن عبد اللہ الوراق الدیبلی۔

دوسرا مشہور شہر منصورہ تھا جس کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم نے ۱۲۰ھ کے قریب ڈالی تھی۔ مشاہیر اہل علم میں قاضی ابو محمد منصوری کے علاوہ اور بھی حضرات تھے، جیسے ابو محمد عبد اللہ ابن جعفر بن مرۃ المنصوری المقری وغیرہ۔

لیکن سوائے قاضی ابو محمد منصوری کے ان بزرگوں نے سندھ سے باہر جاکر اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھا، خود سندھ کی ثقافتی رونق دار الخلافہ سے آئے ہوئے فضلا ہی کی رہین منت ہے، ان میں دو خاندان زیادہ مشہور رہے، قاضی محمد بن ابی الشوارب کا خاندان اور دوسرا شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے اسلاف، موخر الذکر بعد کو ملتان میں منتقل ہو گیا تھا۔

بظاہر سندھ میں وہ مذہبی بحران تھا جس کے ازالے کے لیے علم کلام کی ضرورت پڑتی (اگرچہ خفیہ طور پر اسماعیلی دعاۃ کی کوششوں سے فلسفہ و حکمت کی گرم بازاری ہو رہی تھی) پھر بھی علم کلام کی ترقی سے اس ملک کا نام وابستہ ہے، عمرو بن عبید جو معتزلی علم کلام کے قدیم موسسین میں سے ہے، بقول مسعودی سندی الاصل ہی تھا، بعد کے متکلمین میں سمعانی اور یاقوت نے ابو نصر الفتح بن عبد اللہ السندی کا ذکر کیا ہے[۱]۔ مگر عمرو بن عبید ہو یا ابو نصر فتح بن عبد اللہ باہر ہی جا کر چکے، خود سندھ میں سوائے ان عراقی عالم کے جنھوں نے راجہ مہروک بن رائق کے لیے تعلیمات اسلام پر کتاب لکھی تھی، کسی متکلمانہ سرگرمیوں کا پتہ نہیں چلتا۔

---

[۱] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۳۱۲

Marfat.com

لیکن جہاں تک علوم فلسفیہ کا تعلق ہے یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ سندھ اور بالخصوص ملتان میں خفیہ طور پر ان علوم کی بڑی تیزی سے اشاعت ہو رہی تھی، چوتھی صدی کی ابتدا سے اسماعیلی دعاۃ عالم اسلام میں انقلاب کے لیے زمین ہموار کرتے پھر رہے تھے، غالباً ہندوستان میں بھی وہ اسی زمانہ میں آئے، چنانچہ مسعودی کے بارے میں جو یہاں ۳۰۴ھ میں آیا تھا بعض لوگوں کا یہی خیال ہے، آل بویہ کے برسر اقتدار آنے پر ان کی دعوتی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں،[۱] مگر معز الدولہ کے آخری عہد میں یہ کم ہو گئیں، اور عضد الدولہ کے زمانہ میں تو بہت ہی کم ہو گئیں،[۲] لیکن اس کے مرنے پر عزیز باللہ فاطمی نے ان دعوتی سرگرمیوں کو از سر نو تیز کر دیا،[۳] اس کے نتیجے میں ایک اسماعیلی داعی کے ۳۷۰ھ میں سندھ آنے کا تذکرہ ملتا ہے، جس کا نام ہیثم تھا، سندھ تو ابھی تیار نہ تھا، البتہ ملتان کی فضا انقلاب کے لیے ہموار ہو چکی تھی، لہذا عزیز باللہ نے جلم بن شیبان کو یہاں بھیجا، جس نے ملتان میں بنو سامہ کی سنی حکومت کو ختم کر کے اسماعیلی حکومت قائم کی، اسی نے ملتان کے قدیم بت کو توڑا اور اسماعیلی مذہب کی شدت سے تبلیغ کی، چنانچہ البیرونی کتاب الہند میں لکھتا ہے:-

فلما استولت القرامطة	پس جب قرامطہ ملتان پر قابض ہو گئے
علی الملتان کسر جلم بن شیبان	تو جلم بن شیبان نے اس (قدیم)
المتغلب ذلک الصنم وقتل	بت کو توڑ ڈالا اور اس کے پجاریوں
سدنته[۴]	کو قتل کر دیا

جلم کے بعد شیخ حمید تخت نشین ہوا، اُدھر سامانی سلطنت کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہو چکی تھی (تفصیل آگے آ رہی ہے) سامانی حکومت کے انحلال میں بڑا ہاتھ اسماعیلی دعاۃ کی سازشوں کا تھا، اس لیے سبکتگین کو خراسان میں ان کے خلاف بیخ کنی کی

[۱،۲] الفہرست لابن الندیم ص ۲۶۸ [۳] الفرق بین الفرق ص ۲۷۰ [۴] کتاب الہند للبیرونی ص ۵۶

کوشش کرنا پڑی، منہاج سراج نے لکھا ہے:

"در عہد او کارہائے بزرگ برآمد و مادہ فساد باطنیہ از خراسان قلع کرد۔"[1]

لہذا حزم و احتیاط کا تقاضا تھا کہ وہ مشرقی سرحد سے بھی غافل نہ ہو، یہاں قرامطہ اپنی دسیسہ کاریوں میں مشغول تھے، اسلئے ۳۷۶ھ میں سبکتگین نے ملتان پر حملہ کیا، مگر شیخ حمید نے صلح کرلی، سبکتگین کے بعد اس کا جانشین محمود ہوا، اس کے عہد میں شیخ حمید کے پوتے داؤد نے الحاد و بیدینی [جو اسلام بیزاری اور فلسفہ نوازی کا نام تھا] کی نشر و اشاعت میں جد و جہد شروع کی، اس لیے محمود کو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی، چنانچہ ہمعصر مورخ عتبی لکھتا ہے:-

قد کان بلغ السلطان یمین الدولة	سلطان یمین الدولہ امین الملۃ (محمود غزنوی)
وامین الملة حال والی الملتان	کو ملتان کے والی ابو الفتوح داؤد کی
ابی الفتوح فی خبث نحلته دخل	بد مذہبی، بددینی، بداعتقادی اور بدترین
دخلته وقبح اعتقاده وقبح الحاده ودعا	الحاد کی اطلاع پہنچی تھی، وہ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ
الی مثل رأیه اهل بلده فانف	رعایا کو بھی اس بددینی اور الحاد کی طرف
للدین... حتی افتتحها عنوة....	دعوت دیتا ہے تو سلطان غیرت دینی سے
...والزمهم عشرین الف الف	مجبور ہوا یہاں تک کہ اس نے ملتان کو بزور
درهم[2]	شمشیر فتح کیا اور یہاں کے لوگوں پر دو کروڑ
	درہم تاوان عائد کیا۔

داؤد نے یہ صلح دب کر کی تھی، اس لیے خفیہ طور پر اپنی ملحدانہ سرگرمیوں میں مصروف رہا، بالآخر ۴۰۱ھ میں محمود نے ملتان پر حملہ کرکے اسے تہس نہس کردیا۔ فرشتہ لکھتا ہے:-

---

[1] طبقات ناصری ص ۸ [2] تاریخ یمینی للعتبی ص ۲۱۱ - ۲۱۲

Marfat.com

"وہم دریں سال سلطان دیگر بار از غزنین بملتان آمد و آنرا بجبر و قہر مفتوح ساختہ بسیارے از قرامطہ و ملاحدہ را کشت و بسیارے را دست و پا برید و داؤد بن نصر را زندہ بدست آوردہ ہمراہ خود بغزنین برد و در قلعۂ غور محبوس ساخت تا ہم آنجا بمرد"[1]

یہاں سے خاسر و خائب ہو کر اسماعیلیوں نے منصورہ و سندھ پر قبضہ کر لیا۔ ۴۱۶ھ میں جب محمود سومنات فتح کر کے جا رہا تھا تو منصورہ کے اسماعیلیوں کی شہ سے جاٹوں نے اسے بری طرح پریشان کیا۔ اس لیے اس نے اگلے سال منصورہ پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ ابن الاثیر ۴۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:۔

وقصد المنصورة و كان	سلطان محمود نے منصورہ پر فوجکشی کی
صاحبها قد ارتد عن الاسلام	کیونکہ وہاں کا والی اسلام سے مرتد ہو گیا
...... فاحاط به و بمن	(قرمطی ہو گیا تھا) سلطان نے اسے اور
معه فقتلوا اكثرهم	اس کی فوج کو گھیر لیا اور بہت سے لوگوں کو
فرحل الى غزنة[2]	قتل کیا۔ اس کے بعد غزنی کو روانہ ہوا۔

غرض باطنی (اسماعیلی) دعاۃ نے سندھ اور ملتان میں اتنا شدید پروپیگنڈا کیا کہ تین سو سال کی بنو منبہ کی اور ڈیڑھ سو سال کی ہباریوں کی حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ ظاہر ہے یہ محض بیرونی فوجی امداد کے سہارے ناممکن تھا۔ اس کے لیے اسماعیلیوں نے عرصہ تک مقامی آبادی میں اپنی مذہبی دعوت پھیلائی ہو گی جن کی اکثریت مریدین کے درجہ کی رہی ہو گی۔ اگرچہ ایک معتدبہ جماعت ترقی کر کے "داعی" کے درجہ تک پہنچی ہو گی۔ لیکن مریدین یا دعاۃ دونوں کی تعلیم و تربیت میں باطنیوں کے یہاں علوم فلسفیہ بہت بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ کیونکہ باطنیت کا مقصد ہی

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۶۷ [2] کامل لابن الاثیر جلد تاسع ص ۱۱۱

Marfat.com

اسلام کے بجائے فلاسفہ کی تعلیمات کی اشاعت تھا، اس کی تفصیل سابق میں مذکور ہو چکی ہے، اور بقول مقریزی باطنی دعوت کی آخری منزل میں تو مطولات فلسفہ کے پڑھنے کے علاوہ یہ تعلیم بھی دیجاتی تھی کہ فلاسفہ انبیاء سے افضل ہیں (نعوذ باللہ)

احاله على ما تقرر فى كتب	داعی نو آموز کو ان باتوں پر آمادہ کرے
الفلاسفة من علم الطبيعيات	جو فلاسفہ کی کتابوں میں طبیعیات و
وما بعد الطبيعيات والعلم	الٰہیات و ما بعد الطبیعیات کے سلسلے میں
الالهى وغير ذالك من اقسام	ثابت ہیں، نیز علوم فلسفہ کی دوسری اقسام
العلوم الفلسفية وان الفلاسفة	میں، اور اس بات پر کہ فلاسفہ ہی
انبياء حكمة الخاصة[1]	حکمت خاصہ کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہی الحاد و بے دینی ہے، جس کی طرف عتبی نے "فی خبث نحلته ودخل دخلته و هن اعتقاده و قبح الحاده" کے الفاظ میں اور ابن الاثیر نے "فقد ارتد عن الاسلام" سے اشارہ کیا ہے، بہرحال ان تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ اس تحریک کے سرگرم کارکن فلسفہ کے افاضل بن جائیں، جیسا کہ خراسان میں ابن سینا وغیرہ اسی اسماعیلیت میں توغل کی بنا پر فلسفہ و حکمت میں سرآمد روزگار بن گئے تھے، حافظ ابن تیمیہ[2] نے خود شیخ بو علی سینا سے نقل کیا ہے:-

ان ابن سينا اخبر عن نفسه	ابن سینا نے اپنے متعلق خبر دی ہے کہ
ان اهل بيته اباه واخاه كانوا	اس کے گھر والے یعنی اس کا باپ اور بھائی
من هؤلاء الملاحدة وانه	انھیں بد دین ملاحدہ (قرامطہ اسماعیلیہ)

[1] خطط مقریزی جلد ثانی ص ۲۳۳

انما اشتغل بالفلسفۃ بسبب ذالک[1] — سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کہ وہ صرف اسی وجہ سے فلسفہ میں مشغول ہوا۔

اس لیے یہ باور کرنے کے قوی وجوہ ہیں کہ ملتان و سندھ جہاں ایک عرصہ سے باطنی دعاۃ اپنے مخصوص مناہج فکر پر لوگوں کی تربیت کر رہے تھے، فلسفہ و حکمت کا بڑا گہوارہ ہوں گے اگرچہ تاریخ نے اس ترویج و اشاعت کی تفصیل محفوظ نہیں رکھی، جو بالکل فطری تھا، اس لیے کہ خفیہ انقلابی تحریکوں کی تفاصیل کہیں محفوظ نہیں رکھی جاتیں، صرف معاصرین کے مجمل حوالوں اور قرائن کی مدد سے ان کی تاریخی تفصیلات کی باز تشکیل کی جاتی ہے۔

غرض باطنی دعاۃ کی ایک صدی کی جہد مسلسل نے اس عہد کے "اسلامی ہند" کے مزاج میں باطنیت کے ساتھ تفلسف کو بھی راسخ کر دیا تھا کیونکہ یہ علاقہ نویں صدی تک معقولات کی تعلیم کا گڑھ بنا رہا، یہیں (ملتان) سے مولانا عبد اللہ تلبنی اور عزیز اللہ ملتانی نے دہلی پہنچ کر معقولات کی گرم بازاری کو مزید رونق دی۔

---

[1] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ ص ۱۴۳

(معارف: اپریل ۱۹۶۳ء)

۵

ترک و افغان حکومتیں

ترک و افغان حکومت کو بھی چند ذیلی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

آل سبکتگین (غزنوی خاندان) | غزنوی سلطنت خراسان و ماوراء النہر کی سامانی حکومت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھی،

۳۵۱ھ میں الپتگین جو عبدالملک بن نوح سامانی کا حاجب کبیر رہ چکا تھا، درباری سازشوں کے نتیجہ میں بغاوت کرنے پر مجبور ہوا، اس نے غزنی پہنچکر وہاں کے سامانی حاکم ابوعلی انوک کو نکال دیا اور ایک مستقل حکومت قائم کی، ۳۵۲ھ میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا ابو اسحق جانشین ہوا، اگلے سال اس نے بھی وفات پائی، اور اس کا جانشین ملکاتگین ہوا، دو سال بعد وہ بھی راہی ملک عدم ہوا، اور لوگوں نے امیر پری کو غزنی کا بادشاہ منتخب کیا، مگر اس کے ظلم وستم سے لوگ بہت جلد بد دل ہو گئے، اور سابق حاکم ابوعلی انوک نے حملہ کر دیا، مگر سبکتگین نے جو ابو اسحاق کے زمانہ سے اپنی شہامت و شجاعت

Marfat.com

کی وجہ سے ہردلعزیز تھا، اسے شکست فاش دی، اس لیے لوگوں نے امیر یری کے بجائے اسی کو غزنی کے تخت پر بٹھایا،[۱]

سبکتگین کی ظاہری کمزوری و مسکینی سے دھوکا کھا کر پنجاب کے راجہ جیپال نے ایک لشکر جرار کے ساتھ حملہ کیا، لیکن شکست کھائی اور تاوان جنگ کے وعدہ پر صلح کر کے واپس لوٹا، مگر لاہور آکر وعدہ خلافی کی، اس لیے سبکتگین نے حملہ کر کے اسے شکست فاش دی، اس کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھتا، مگر اسے خراسان کی سیاست میں الجھنا پڑا جہاں فرقہ باطنیہ (اسماعیلیوں) کی ریشہ دوانیوں سے انتشار برپا تھا، اس لیے اس نے اپنی توجہ باطنیۂ خراسان کے استیصال پر مرکوز کر دی۔[۲]

۳۸۷ھ میں سبکتگین نے وفات پائی، اور کچھ دن بعد محمود غزنی کے تخت پر بیٹھا، وہ بھی خراسان ہی کی سیاست میں الجھا رہتا، مگر مشرقی سرحد پر ملتان کا قرمطی حکمراں داؤد علانیہ الحاد و بیدینی کی اشاعت کر رہا تھا، دوسری طرف مغربی سرحد پر خوارزم قرامطہ (اسماعیلیہ) کا گڑھ بنا ہوا تھا، اس طرح وہ دونوں طرف سے خطرے میں گھرا ہوا تھا، اس لیے پہلے اس نے ملتان کی طرف توجہ کی، مگر پنجاب کے ہندو راجاؤں نے جنہیں داؤد نے حلیف بنا لیا تھا، مزاحمت کی، اس پر محمود کو ان سے نپٹنا پڑا، اس کے نتیجہ میں ہندوستان کا شمالی مغربی حصہ غزنوی سلطنت کا مشرقی صوبہ بن گیا، جسکی تفصیل اوپر گذر چکی ہے،

۴۰۳ھ میں فاطمی خلیفہ مصر نے پھر مشرق میں باطنی (اسماعیلی یا قرمطی) انقلابی تحریک کی تنظیم کے لیے ایک سفیر روانہ کیا، مگر محمود نے اسے انتہائی بے عزتی کے ساتھ نکلوا دیا،[۳] اور دوسری اسماعیلی سازشوں کی نگرانی بھی شروع کر دی، ان میں سب سے اہم شیخ بوعلی سینا تھا، جو نام نہاد اسلامی فلسفہ" کا واضع ہے، وہ خوارزم میں اندر ہی اندر اس تحریک کو منظم کر رہا تھا۔ اس لیے

---

۱ زین الاخبار گردیزی ص ۴۴ ۲ طبقات ناصری ص ۸ ۳ تاریخ یمینی للعتبی ص ۲۹۶

محمود نے ابو العباس مامون والی خوارزم کو لکھا کہ وہ اپنے دربار کے فضلا کو غزنی بھیجدے، اس طرح وہ ابن سینا کو غزنی میں نظربند کرنا چاہتا تھا، البیرونی اور دیگر فضلا تو خوشی سے غزنی روانہ ہو گئے، مگر ابن سینا نکل بھاگا، اور جرجان پہنچا،[1] اور جب وہاں بھی محمود کے فرستادوں نے پیچھا نہ چھوڑا تو رے چلا گیا، جو مجد الدولہ بویہی کے زیر حکومت معتزلہ اور قرامطہ کا ایک اور گڑھ تھا،[2] وہاں سے ہمدان پہنچا اور جتنے دن وہاں رہا فتنہ و فساد ہی کراتا رہا،[3] آخر کار اصفہان پہنچا جہاں علاء الدولہ کاکویہ نے اس کی فتنہ پرور اور ہنگامہ آرا سرگرمیوں کی بدل و جان قدر کی، اسی کے یہاں ۴۲۸ھ میں اس نے وفات پائی،[4]

۴۰۷ھ میں محمود کو خوارزم میں اس لیے مداخلت کا موقع مل گیا کہ درباریوں نے ابو العباس مامون کو، جو اس کا بہنوئی تھا، قتل کر ڈالا، اس لیے محمود نے خوارزم کو فتح کر کے جن لوگوں پر قرمطی ہونے کا ذرا سا بھی شبہ تھا، سخت سزائیں دیں، تاریخ روضۃ الصفا میں ہے:-

"نیال تگین را با تو میکہ در تہیج فتنہ سعی کردہ بود نہ بفرمود تا بخلق برکشیدند ..... وجمعے اسیران ابغزنین فرستادہ بحبس گردانیدہ و بعد از چند گاہ ہمہ را بخشیدہ در زمرۂ تجند در وازنہ ساختہ"[5]

ان ہی منتو بین میں ابو ریحان البیرونی بھی تھا، جسے وہ اپنے ہمراہ ہندوستان لے گیا، جہاں اس نے سنسکرت زبان اور ہندو علوم میں تبحر حاصل کیا،

۴۲۰ھ میں محمود نے رے کو بھی فتح کر لیا اور بقول ابن الاثیر،

وصلب من اصحابه (اصحاب مجد الدوله) الباطنية خلقاً كثيراً ونفي المعتزلة الى	اور مجد الدولہ کے متوسلین میں سے باطنیوں کی کثیر تعداد کو پھانسی پر چڑھایا، اور معتزلہ کو خراسان کی طرف جلا وطن کیا، فلسفہ

---

[1] چہار مقالہ گب میموریل ایڈیشن ص ۷۷ - ۸۰، [2] سرگذشت ابن سینا ترجمہ سعید نفیسی ص ۷ [3] ایضاً ص ۱۰، ۹ [4] ایضاً ص ۱۱ [5] روضۃ الصفا ج ۴ ص

خراسان واحرق کتب الفلسفة ومذهب الاعتزال والنجوم و اخذ من الکتب ماسوی ذلک فانۃ حمل[1]

اعتزال اور نجوم کی کتابوں کو جلا دیا اور باقی کتابوں کے بنڈ ل گھر (غزنی) لے گیا،

محمود نے اس علاقے کی حکومت اپنے بیٹے مسعود کو تفویض کی جس نے یہاں کے انتظام سے فارغ ہوکر اصفہان پر فوج کشی کی، اس جنگ میں علاء الدولہ ابن کاکویہ کی بہن گرفتار ہوکر آئی، جس سے علاء الدولہ بہت پریشان ہوا، مگر بوعلی سینا نے حکمت عملی سے کام لیکر مسعود سے کہلا بھیجا کہ یہ شہزادی آپ کی ہم مرتبہ (کفو) ہے، آپ اس سے شادی کرلیں، علاء الدولہ اصفہان آپکے سپرد کردے گا، اس تدبیر سے مسعود نے اس سے شادی کرلی،[2]

۴۲۱ھ میں محمود نے وفات پائی اور کچھ دن بعد مسعود تخت پر بیٹھا، اس نے ابوسہل حمدونی کو عراق میں اپنا گورنر مقرر کیا اور علاء الدولہ کو اصفہان کا منشور ولایت بخشا،[3] مگر کچھ دنوں کے بعد اس نے خودمختاری کا دعویٰ کردیا، مسعود نے لکھا کہ اگر وہ اس حرکت سے باز نہ آیا تو اس کی بہن لشکر کے رندوں کے سپرد کردی جائے گی، علاء الدولہ کو بھی تشویش ہوئی، مگر بوعلی سینا کے مشورے سے کہلا بھیجا کہ بیوی تو وہ تمھاری بنا ہے، اس کی بیعزتی کی شرم بھائی سے زیادہ شوہر کو آنی چاہئے، اس پر مسعود نے اسے عزت و احترام کے ساتھ اس کے میکہ بھیجدیا،[4]

ابوسہل حمدونی نے جو مسعود کی جانب سے علاء الدولہ کی تادیب پر مامور تھا لشکر کشی جاری رکھی اور علاء الدولہ کو ہزیمت پر ہزیمت ہوتی رہی، ان مسلسل جنگوں کا علمی سانحہ یہ تھا کہ ہمدان کی تاخت کے سلسلے میں بوعلی سینا کی بہت سی تصانیف بھی اس کے گھربار کے ساتھ لٹ گئیں،

---

[1] کامل لابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۲۶ [2] تتمہ صوان الحکمہ للبیہقی [3] روضۃ الصفا جلد چہارم [4] تتمہ صوان الحکمہ

Marfat.com

وکان الشیخ الحکیم ابو علی بن سینا	اور شیخ حکیم ابو علی بن سینا علاء الدولہ بن
وزیر الملک علاء الدولہ فاغار	کاکویہ کا وزیر تھا، لہذا تاش فراش (جو ابو سہل
عسکر تاش فراش علی بیت کتب	کے ساتھیوں میں سے تھا) کے لشکر نے بو علی سینا
ابی علی ونقلوا اکثر تصانیفہ د	کے کتب خانہ کو بھی لوٹا اور انکی بہت سی
کتبہ الی خزانۃ کتب غزنۃ د	مصنفات نیز ملوکہ کتابوں کو غزنی کے کتب خانہ میں
کانت فیھا مجموعۃ [1]	منتقل کیا گیا جہاں وہ (علاء الدین جہانسوز
	کے حملہ تک) جمع رہیں

لیکن ابن سینا کے حسن تدبیر سے علاء الدولہ نے پیہم شکستوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری، یہانتک کہ مسعود کو سلاجقہ نے کمزور کر دیا اور بالآخر علاء الدولہ نے ابو سہل حمدونی کو صوبہ جبال سے بید خل کر دیا۔[2]

۴۳۳ھ میں مسعود سلاجقہ کی شورش دبانے میں ناکام ہونے کے بعد ہندوستان چلا گیا راہ میں نمکحرام غلاموں نے قتل کر دیا، اس کے بعد پہلے اس کا بھائی محمد اور پھر بیٹا مودود تخت نشین ہوئے، مودود کے بھائی مجدود لے جو ہندوستان میں باپ کا نائب السلطنت تھا، علم خود مختاری بلند کیا اور لشکر زار ان لیکر لاہور پہنچا، مودود نے بھی اس کے تدارک کے لیے ایک لشکر بھیجا، مگر ابھی یہ لشکر پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ مجدود بقر عید کے دوسرے دن اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا، کچھ دن بعد غزنویوں کی کمزوری سے فریب کھا کر ہندوستان کے راجاؤں نے متفق ہو کر لاہور پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی۔[3]

مودود نے ۴۴۱ھ میں وفات پائی، اس کے بعد عبد الرشید بن مسعود تخت پر بیٹھا، مگر دو سال بعد اسکے محسن کش غلام طغرل نے اسے شہید کر ڈالا، کچھ دن بعد ارکان دولت نے طغرل کو قتل کر کے فرخ زاد ابن مسعود کو تخت پر بٹھایا، اس کی وفات (۴۵۱ھ) کے بعد ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا، ابراہیم نے

---

[1] اخبار الدولۃ السلجوقیہ ص ۷ [2] روضۃ الصفا جلد چہارم [3] ایضاً

Marfat.com

۴۶۹ھ میں اپنے بیٹے ابوالقاسم محمود کو ہندوستان میں اپنا نائب سلطنت بنایا جس کی تہنیت میں مسعود سعد (سلمان) کا قصیدہ مشہور ہے، اسی زمانہ میں نظام الدین ابونصر ہبۃ اللہ الفارسی نے لاہور میں ایک بہت عمدہ خانقاہ تعمیر کرائی، عوفی نے اس عہد کے ایک اور مشہور فاضل ابوالعلاء عطا بن یعقوب الکاتب کا ذکر کیا ہے جو لاہور میں نظر بند تھے، جب سلطان ابراہیم ہندوستان آیا تو انھوں نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں اپنے متعلق کہا تھا ؎

بے گنہ ماندہ ہشت سال بہ بند　　　چوں گنہگار در عذاب الیم

ابراہیم نے ۴۹۲ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا مسعود اس کا جانشین ہوا، جس نے اپنے بیٹے شیرزاد کو اپنے ہندوستانی مقبوضات کا نائب السلطنت بنایا، مسعود کے بعد پہلے ارسلان شاہ اور پھر بہرام شاہ تخت پر بیٹھے، بہرام شاہ کے زمانہ میں غور کا ایک شہزادہ ملک قطب الدین بھائیوں سے ناراض ہو کر غزنی چلا آیا تھا، مگر بہرام شاہ اس سے بدظن ہو گیا، اور اسے خفیہ طور پر مروا ڈالا، اس کے بھائی سلطان سوری نے انتقاماً غزنی پر حملہ کیا، بہرام شاہ ہندوستان چلا گیا، مگر جاڑے کے موسم میں جبکہ غور کا راستہ برف سے بند ہو گیا، تو غزنی لوٹ آیا اور سوری کو شکست دے کر اس کے وزیر کے ساتھ پھانسی پر چڑھا دیا[1]، سوری کے بھائی علاء الدین حسین نے بھائی کے انتقام میں بہرام شاہ پر فوج کشی کر کے شکست دی اور وہ پھر ہندوستان بھاگ گیا، علاء الدین نے غزنی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، اسی لیے وہ تاریخ میں "علاء الدین جہانسوز" کے نام سے مشہور ہے، علاء الدین کی واپسی پر بہرام شاہ پھر غزنی واپس آیا جہاں ۵۵۲ھ میں وفات پائی،

بہرام شاہ کے بعد اس کا بیٹا خسرو شاہ تخت نشین ہوا، غوریوں کی کینہ جوئی کی وجہ سے غزنوی سلاطین کی شوکت و حشمت یونہی ختم ہو چکی تھی کہ غزوں کی شورش شروع ہوئی اور ۵۵۶ھ

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۲-۱۳

میں غزنی پر ان کا قبضہ ہو گیا،[1] خسرو شاہ ہندوستان چلا آیا، جہاں ۵۵۵ھ میں اس نے وفات پائی، اور اس کا بیٹا خسرو ملک اس کا جانشین ہوا لیکن غوریوں کی کینہ پروری نے ہندوستان میں بھی غزنویوں کو چین سے نہ رہنے دیا اور ۵۸۲ھ میں محمد غوری نے لاہور کو فتح کر کے غزنوی خاندان کا خاتمہ کر دیا اور بقول منہاج سراج

" خاندان آل ناصر الدین سبکتگین مندرس گشت ...... و پادشاہی ایران و تخت ہندوستان و ممالک خراسان بملوک و سلاطین شنسبانیان رسید[2]

غزنوی سلطنت سامانی حکومت کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھی جن کی قدرشناسی علم و ادب کے بارے میں ایک چشم دید سیاح مقدسی لکھتا ہے:-

ومن رسومهم انهم لا يكلفون اهل العلم تقبيل الارض ...... ويختارون ابداً افقه من بخارا فاعظمهم فيرفعونه ويصدرون عن رايه ويقضون حوائجه ويولون الاعمال بقوله[3]

سامانی بادشاہوں کا دستور ہے کہ وہ طبقہ علماء کو زمین بوسی کی تکلیف نہیں دیتے ..... اور بخارا میں جو عالم سب سے زیادہ فقہ داں اور پرہیزگار ہوتا ہے اسے منتخب کر کے اسے بلند مرتبہ دیتے ہیں اور اسی کے مشورے پر عمل کرتے ہیں اس کی حاجتوں کو پورا کرتے ہیں، اور اسی کی سفارش پر عہدہ دار مقرر کرتے ہیں،

اسی لیے دیگر لوازم سلطنت کے ساتھ غزنویوں نے سامانیوں سے علم و ادب کی سرپرستی بھی ورثہ میں پائی تھی، اس خاندان (غزنویہ) کا واسطۃ العقد محمود غزنوی تھا، جو خود عالم اور علماء نواز تھا۔

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۷، [2] ایضاً ص ۱۸، [3] احسن التقاسیم مقدسی ص ۳۴۸

جواہر مضیئہ میں اسے فقہائے احناف میں شمار کیا گیا ہے اور لکھا ہے :-

السلطان محمود من اعیان الفقہاء وفرید الدھر فی الفصاحۃ والبلاغۃ ...... ولہ التصانیف فی الفقہ والحدیث والخطب والرسائل ولہ شعر جید ...... ومن تصانیفہ کتاب التفرید علی مذہب ابی حنیفہ مشہور فی بلاد غزنۃ[1]

سلطان محمود مشہور فقہا میں سے تھا، فصاحت وبلاغت میں یکتائے روزگار تھا.... فقہ حدیث میں کئی کتابیں اس کی تصنیف ہیں، اور خطب، رسائل کا بھی مصنف ہے، اسکے اشعار بھی اچھے ہیں...... اس کی تصانیف میں سے کتاب التفرید مشہور ہے، جو حنفی فقہ میں ہے اور غزنی کے علاقہ میں متداول ہے.

ابن اثیر اس کی علمی سرپرستی اور فضل نوازی کے بارے میں لکھتا ہے:

کان یمین الدولۃ محمود بن سبکتگین عاقلا دینا خیرا عندہ علم ومعرفۃ وصنف لہ کثیر من الکتب فی فنون العلوم وقصدہ العلماء من اقطار البلاد وکان یکرمھم[2]

یمین الدولہ محمود بن سبکتگین عقلمند، دیندار اور نیکوکار تھا، صاحب علم ومعرفت تھا. مختلف علوم وفنون میں کثیر التعداد کتابیں اس کے نام پر تصنیف کی گئیں، دور دراز شہروں کے علما اس کے دربار میں آتے تھے. اور وہ عزت واکرام سے انہیں نوازتا تھا،

سنہ ۴۰۹ھ میں قنوج کی مہم سے واپسی پر اس نے غزنی میں ایک خوبصورت مسجد اور ایک عظیم الشان مدرسہ بنایا تھا اور اس مدرسہ کے لیے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا، روضۃ الصفا میں ہے:-

---

[1] جواہر المضیئہ جلد ثانی ص ۱۵، [2] کامل ابن اثیر جلد تاسع ص ۳۹

Marfat.com

"ودر جوار آں مسجد مدرسہ بنیاد نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ آں را موشح گردانید۔"[1]

لیکن باایں ہمہ معارف پروری علوم عقلیہ کی سرپرستی میں محمود کا کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ وہ ان علوم کا دشمن تھا، اور چونکہ معتزلہ بھی عقلیت کے پرستار تھے، اس لیے وہ ان سے بھی بیزار تھا، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں عقلیت کے قائلین معتزلی سمجھے جاتے تھے، چنانچہ محمد بن الفضل البلخی نے اس کے نام پر جو کتاب الاعتقاد لکھ کر معنون کی تھی، اس میں لکھا تھا:-

من قال ان العقل افضل من العلم فهو معتزلی[2]	جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ عقل علم سے افضل ہے تو وہ معتزلی ہے۔

بہرحال محمود نے معتزلہ کی بیخ کنی میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، فتح رے کے بعد القادر باللہ عباسی کو جو فتحنامہ لکھ کر بھیجا تھا، اس میں حسب تصریح روضۃ الصفا مذکور تھا:-

"ومعتزلہ کہ در رے اقامت داشتند ہمہ را کوچانیدہ بخراسان فرستادیم۔"[3]

احمد بن یحییٰ المرتضیٰ نے "کتاب منیۃ الامل" (باب ذکر المعتزلہ) میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے مشاہیر معتزلہ میں سے تین عالم محمود کے حکم سے جلاوطن کیے گئے:-

ومنهم ابو الفتح الاصفهانی ..... وورد الكتاب من محمود سلطان زمانه بحمل المعتزلة الى حضرته بغزنة فحمل من نیسابور ثلثة نفر هو وابو صادق امام مسجد الجامع وابو الحسن	عبدالجبار استرآبادی کے شاگردوں میں سے ابوالفتح الاصفہانی بھی تھا ..... بادشاہ وقت محمود کا فرمان آیا کہ معتزلہ کو غزنی دار السلطنت میں بھیجا جائے، چنانچہ نیشاپور سے تین فضلاء ابوالفتح اصفہانی، ابوصادق امام جامع مسجد

---

[1] روضۃ الصفا جلد ۴ ص ۴۱ [2] الجواہر المضیئہ جلد ثانی ص ۱۱۱ [3] روضۃ الصفا جلد ۴ ص ۴۰

Marfat.com

الصابری المعروف بسیبویہ لعلمہ بالنحو فبعث بھم الی قصدار فماتوا ھنالک[۱]

اور ابوالحسن الصابری جو علم نحو کے سیبویہ کہلاتے تھے، لیجائے گئے، انہیں قصدار بھیجا گیا، جہاں تینوں نے وفات پائی،

قاضی عبدالجبار کے اثر سے رے میں اعتزال کی بڑی گرم بازاری تھی، اور وہاں کے کتب خانہ میں اس مذہب کی بے شمار کتابیں تھیں، مگر محمود نے سب کو جلوادیا۔ روضۃ الصفا میں ہے:

در خانۂ مجدالدولہ کتب بسیار بود، آنچہ مشتمل بود بر سخنان حکما و اہل اعتزال بموجب فرمان سوختہ گشت و باقی را بخراسان بردند[۲]

رہا فلسفہ تو وہ باطنیت و قرمطیت کا شعار تھا، جو محض ایک علمی تحریک نہیں، بلکہ ایک خطرناک انقلابی اور سیاسی تحریک تھی، لہٰذا اس کے استیصال میں اس نے جو کچھ کیا حزم و احتیاط کا عین مقتضا تھا، مگر محمود کی سیاسی فتوحات بالخصوص اس کے ہندوستانی حملوں نے باطنی انقلاب پسندوں کی ریشہ کاریوں پر پردہ ڈال رکھا ہے، ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان پر اس کا حملہ ہوس ملک گیری سے زیادہ حزم و احتیاط کا نتیجہ تھا، وہ قرامطہ کی سازشوں کو بروئے کار آنے سے پہلے ہی ان کا قلع قمع کردینا چاہتا تھا، یہ اسی حزم و احتیاط کا نتیجہ تھا کہ اس نے فردوسی کی جگر کاوی کا صلہ نہیں دیا، البیرونی کی قدر و منزلت نہ کی، اور شیخ بو علی سینا اس سے بھاگتا پھرا،

اسی طرح محمود کو نجوم و ہیئت سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، حالانکہ اس زمانہ میں خراسان سے لے کر مصر و مغرب تک تمام معاصر حکمراں ان فنون کی ترقی میں بیش از بیش کوشاں تھے، محمود کی نجوم سے بے اعتنائی کا اندازہ حسب ذیل حکایت سے ہوسکتا ہے، جو عوفی نے "جوامع الحکایات" میں نقل کی ہے:

سلطان محمود بن سبکتگین انار اللہ برہانہ کے دربار میں بیسیوں ایسے مشہور منجم جمع تھے جو اس فن

[۱] باب ذکر المعتزلہ مرتبہ آرنلڈ ص ۰، [۲] روضۃ الصفا ج ۴ ص ۰

میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، مگر سلطان کسی معاملے میں ان کی رائے نہ لیتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی منہ لگے مصاحب نے دریافت کیا کہ علم نجوم کے اتنے بڑے بڑے استاد حضور کے پاس جمع ہیں مگر کبھی آپ ان سے کوئی بات نہیں پوچھتے۔ پھر ان کی موجودگی کا کیا فائدہ؟ سلطان نے جواب دیا،

"......میرے معاملات کی بنیاد دو باتوں پر ہے: خدا پر توکل اور شریعت کا فتویٰ۔"[1]

اس نجوم بیزاری ہی کا نتیجہ تھا کہ البیرونی کو صحیح پیشین گوئی کرنے پر بجائے انعام دینے کے قید خانہ بھیج دیا، نجوم کے علاوہ ہیئت کو بھی وہ الحاد و بیدینی سمجھتا تھا، چنانچہ یاقوت نے لکھا ہے:۔

"انه ورد علیه رسول من اقصی بلاد الترک وحدث بین یدیه[2] ما شاهد فیما وراء البحر نحو القطب الجنوبی من دور الشمس علیه ظاهرة فی کل دوره فوق الارض بحیث یبطل اللیل فسارع علی عادته فی التشدد فی الدین الی نسبة الرجل الی الالحاد والقرمطة۔"[2]

ترکستان کی (شمالی) سرحد سے ایک سفیر محمود کے دربار میں آیا اور جو کچھ اس نے سمندر کے اس جانب قطب جنوبی (قطب شمالی) کی طرف دیکھا تھا، محمود کے سامنے بیان کیا کہ سورج چھ مہینے تک، اپنے پورے دور میں زمین کے اوپر بدیں طور رہتا ہے، کہ رات ہوتی ہی نہیں، یہ سنکر محمود نے جیسا کہ تعصب فی الدین کی اسے عادت تھی، اس قاصد پر الحاد و قرمطیت کا الزام لگایا۔

باایں ہمہ اس کا عہد تاریخ اسلام کے عظیم ترین ہیئت داں البیرونی کے ظہور و نبوغ کے لیے مشہور ہے۔ البیرونی ہندوستان کا باشندہ نہ تھا، اور نہ اس نے یہاں توطن اختیار کیا تھا، وہ یہاں محمود کے ہمراہ آیا جایا کرتا تھا، اسی سیر و سفر کے دوران میں اس نے ہندوؤں کے علوم کی تحصیل یہاں کے

---

[1] جوامع الحکایات، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۱۰۷ – ۱۰۸۔ [2] معجم الادباء، جلد سادس ص ۳۱۰

Marfat.com

منڈتوں سے کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے متعدد شہروں کے عرض البلد دریافت کیے، چنانچہ لکھتا ہے کہ

"میں نے خود قلعہ لاہور کے عرض البلد کی پیمائش کی، تو ۳۴° ۳ دقیقہ پایا...... دوسرے عرض البلد جو میں نے دریافت کیے وہ یہ ہیں: لمغان ۳۴° ۴۳ دقیقہ پشاور ۳۴° ۴۴ ویہند ۳۴° ۳۰ جیلم ۳۳° ۲۰ قلعہ مندا ۳۲° ۵۰ سیالکوٹ ۳۲° ۵۸ مندکور ۳۱° ۵۰ ملتان ۲۹° ۴۰"[1]

لیکن البیرونی کے قیام ہندوستان کا مشہور علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ۴۱۷ھ کے قریب سندھ میں سمندر کے نزدیک محیط ارضی کی پیمائش کی جو ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، اس سے پہلے وہ دہستان میں اس تجربہ کی کوشش کر چکا تھا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، چنانچہ قانون مسعودی میں لکھتا ہے۔

وعلی شدة حرصی ان اتولی	مجھے اس (محیط ارضی کی پیمائش) کی تحصیل کا
الاعتبار واختیاری له	بیحد شوق تھا، اور میں نے شمالی دہستان کیا
فاعتصفت فی شمال دهستان	جو جرجان کا حصہ ہے ایک چورس اور چٹیل
التی بارض جرجان - ثم عجزت	میدان منتخب کیا تھا، مگر وہاں کے تھکا دینے والے
عن المفاوز المتعبة والمعین	بیابانوں نے مجھے عاجز کر دیا، نیز میں اس درجہ
الصادق علیه عدلت فیه[2]	ناکام رہا کہ مجھے وہاں کوئی سچا مددگار دستیاب نہ ہو سکا۔

اس ناکام تجربہ کے ذکر کے بعد وہ ہندوستان میں اس کے دوبارہ کرنے اور کامیاب ہونے کا بیان کرتا ہے۔

"جب مجھے سرزمین ہندوستان میں ایک پہاڑ ملا جہاں سے ایک چورس بیابان نظر آتا تھا،

---

[1] کتاب الہند ص ۱۶۳ [2] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۰۳

اور یہ بیابان سمندر کی سطح کے مانند مستوی تھا. تو میں نے اس پہاڑ کی چوٹی پر زمین آسمان کے ملنے کی جگہ یعنی دائرہ افق کا قیاس لگایا. اور معلوم کیا کہ وہ خط مشرق و مغرب سے ۳۵ دقیقہ سے ذرا کم ہے، میں نے اسے ۳۴ دقیقہ فرض کیا، اور پھر پہاڑ کی اونچائی دریافت کی، اسکے لیے میں نے ایسے دو مقاموں سے جو اس کے اصل عمود کی سیدھ میں تھے، اس کا ارتفاع ناپا تو ۶۵۲ گز تھا۔[1]

اسی طرح کتاب التفہیم میں مامونی منجمین کے نہج پر ہندوستان میں محیط ارضی کی دریافت کے تجربے کے اعادے کے سلسلے میں لکھتا ہے :-

وقد اعتبرت انا ذلک بارض	میں نے سرزمین ہند پر اس تجربے کی تصدیق کی تو
الہند فلم یخالف شئ یعبابہ	کوئی معتدبہ فرق نہ نکلا.

بہرحال محیط ارضی کی پیمائش کا یہ پہلا تجربہ تھا، جو سرزمین ہند پر کیا گیا. اس سے پہلے دو مرتبہ یہ تجربہ کیا گیا تھا پہلی مرتبہ اراٹوستھنیس نے اسکندریہ میں اور دوسری مرتبہ مامونی منجمین نے عراق میں.

محمود کے بعد مسعود تخت نشین ہوا. اس نے بھی باپ کی علم دوستی و ہنرپروری کی روایات کو جاری رکھا، ابن الاثیر لکھتا ہے :

وکان السلطان مسعود شجاعا	سلطان مسعود شجاع، سخی اور صفات حمیدہ
کریما ذا فضائل کثیرۃ محبّاً	سے متصف، علماء کو دوست رکھنے والا
للعلماء کثیر الاحسان الیھم	اور ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے
والتقرب بھم صنفوا التصانیف	والا تھا، علماء نے مختلف علوم و فنون میں
الکثیرۃ فی فنون العلم[2]	بہت سی تصانیف اسکے نام پر لکھیں،

لیکن باپ کے برخلاف اس نے علم و حکمت بالخصوص نجوم و ہیئت کی سرپرستی پر خاص توجہ کی یاقوت لکھتا ہے

---

[1] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۳۰ [2] کامل ابن الاثیر جلد تاسع ص ۱۴۰

لیکن اس کے بیٹے سلطان مسعود کو علم نجوم	اما ابنه السلطان مسعود فقد كان
پر خاص توجہ تھی، اور حقائق علوم	فيه اقبال على علم النجوم ومحبة
سے اس کو محبت تھی،	لحقائق العلوم[1]

محمود کو فلسفہ کی کتابوں سے اتنا بغض تھا کہ رے کی فتح کے موقع پر انھیں جلوا دیا تھا، مگر جب ابو سہل حمدونی نے شیخ بو علی سینا کا کتبخانہ لوٹا تو مسعود نے اسے شاہی کتبخانہ میں داخل کرا دیا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے:-

بو علی سینا علاء الدولہ کے دربار میں	وكان ابو علي سينا في خدمة علاء الدولة
تھا لہذا اس کی کتابیں بھی لٹ کر غزنی آئیں	فاخذت كتبه وحملت الى غزنة
جہاں شاہی کتبخانہ میں داخل کی گئیں	فجعلت في خزائن كتبها[2]

مسعود ہی کے نام پر البیرونی نے "قانون مسعودی" معنون کی جس کے صلے میں اس نے ہاتھی کے وزن برابر چاندی دینا چاہی، مگر البیرونی کی سیر چشمی نے اسے قبول نہ کیا[3]، مسعود کے بعد مودود تخت پر بیٹھا جس کے نام پر اس نے "الجماہر فی الجواہر" اور "کتاب الدستور" معنون کیں[4]،

پانچویں صدی ہجری کے وسط سے لاہور اسلامی ثقافت کا مرکز بن گیا تھا، اور بعد میں تو غزنوی سلاطین (خسرو شاہ اور خسرو ملک) کا دار السلطنت ہی رہا، اس لیے یہاں کا دیوان کتابت غزنی اور دیگر ممالک ایران کے دفاتر کے نمونے پر قائم ہوا تھا: جہاں کتاب علوم ادبیہ کے ساتھ علوم دینیہ و علوم عقلیہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، چنانچہ عبداللہ ابن المقفع جو منصور کے عہد کا کاتب تھا، ارسطا طالیسی منطق کا پہلا مترجم تھا، برمکی خاندان کا وزیر ابن العمید منطق و حکمت اور ریاضی و ہیئت میں سر آمد فضلائے روزگار تھا، انھیں فضلائے نامدار کی [illegible] دیوان کتابت میں عہدہ دار تھے، اس لیے یقیناً یہ بھی فلسفہ و حکمت میں تجربہ رکھتے ہونگے۔ یہ شروع زمانہ کے کتاب خراسان سے تعلیم مکمل کر کے آئے ہوں گے مگر بعد میں ان کی تعلیم کا انتظام یہیں ہوا ہوگا،

---

[1] معجم الادبا جلد سادس ص ۱۴۰ [2] کامل لابن الاثیر جلد ۹ ص ۱۵۰ [3] معجم الادبا سادس ص ۳۱۱ - ۳۱۰

غرض پانچویں صدی کے وسط سے مدارس لاہور کے نصاب میں فلسفہ وہیئت متداول تھے، کیونکہ مسعود سعد سلمان جو لاہور میں پیدا ہوا تھا، اور جس نے یہیں تعلیم پائی تھی، ۴۶۹ھ میں ابوالقاسم سیف الدولہ محمود کے نائب امیر ہندوستان بنائے جانے کی تہنیت میں کہتا ہے:-

منجماں ہمہ گفتند کایں دلیل کند — بحکم زیج بتانی کرہست در تقویم
کہ دیر و زود خطیباں کنند بر منبر — بنام سیف دول خطبہائے ہفت اقلیم
بسال پنجہ ایں پیش گفت بوریحاں — دراں کتاب کہ کردہ است نام او تفہیم
کہ پادشاہے صاحب قراں شود پیدا — چو سال ہجرت بگذشت تے و سین و نجیم

ظاہر ہے "زیج البتانی" اور "کتاب التفہیم" اور ان کے مضامین کا بے تکلف ذکر وہی لوگ کرسکتے ہیں جو نجوم و ہیئت کے طالب علم رہے ہوں، مگر مسعود سعد سلمان نجوم کا ماہر خصوصی نہیں تھا، اس فن میں اتنا ہی درک رہا ہوگا جتنا اس زمانہ کے عام طلبہ کو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں لاہور کے مدارس کے اندر حکمت و معقولات کا معیار خاصہ بلند تھا، اور خراسان کے اندر ابوالعباس اللوکری کے نفس گرم کی تاثیر سے فلسفہ و حکمت کی جو اشاعت ہو رہی تھی اس کا اثر اسلامی ہندوستان تک بھی آگیا تھا، مگر اس عہد کا کوئی علمی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ عوفی نے غزنویوں کے آخری زمانہ میں لاہور کے اندر ایک فلسفی کی نشاندہی کی ہے جن کا نام یوسف بن محمد دربندی تھا، "لباب الالباب" میں لکھتا ہے:

تقۃ الدین جمال الفلاسفہ یوسف بن محمد الدربندی: بوفور فضائل مشہور و فنون محامد مذکور .....
در دولت خسرو ملک سالہا دیدہ بود..... یکے از عزہائے بزرگ در خطہ لاہور تربت اوست[1]"

یوسف بن محمد کے لقب "جمال الفلاسفہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور میں اور بھی فلاسفہ تھے جن کے گل سرسبد یوسف بن محمد دربندی تھے۔

---

[1] لباب الالباب عوفی جلد اول ص ۱۰۶

(معارف: مئی ۱۹۶۳ء)

۶

آلِ شنسب، غوری خاندان ۵۸۳ھ میں غزنوی خاندان کے خاتمہ کے بعد غوریوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز ہوا، اور ۶۰۲ھ میں محمد غوری کی شہادت کے بعد ہندوستان میں ان کا اقتدار ختم ہو گیا. اگرچہ اس ملک پر ان کی یورشوں کا سلسلہ ۵۷۱ھ سے شروع ہو چکا تھا، اور شہاب الدین کے بعد غور و غزنی میں کچھ اور عرصے تک اس خاندان کی حکومت رہی، مگر ہندوستان میں غوری سلطنت کا زمانہ یہی انیس سال ہے، کیونکہ اس کے بعد اس ملک میں ایک نئے حکمراں سلسلے (ممالیک یا غلام خاندان) کا آغاز ہوا، سابق حکمرانوں کی طرح غوری فاتحین بھی ہندوستان میں قیام سلطنت کے ارادے سے نہیں آئے تھے. مگر بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ شمالی ہندوستان کا بڑا حصہ فیروزکوہ کی "نوآبادی" بن گیا. اسکی بنیادی وجہ غوریوں اور غزنویوں کی خاندانی عداوت تھی، جس کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے.

غوری جو خود کو افسانوی "ضحاک تازی" کی اولاد بتاتے تھے، تاریخ میں غور کے پہاڑی علاقے کے سردار کی حیثیت سے نمودار ہوئے. پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ ملک عزالدین الحسین بن الحسن تھا. اس کے سات بیٹے تھے. بڑے بیٹے ملک فخر الدین مسعود (جو بعد میں بامیان کا بادشاہ ہوا)

Marfat.com

اور اس سے چھوٹے ملک قطب الدین محمد کی ماں اونچے خاندان کی نہ تھیں، اس لیے باپ کے مرنے پر تیسرا بیٹا سوری اس کا جانشین ہوا۔ وہ اس خاندان میں پہلا شخص ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، بادشاہ ہونے کے بعد اس نے باقی چھ بھائیوں کو مختلف اقطاع ملک کی حکومت تقسیم کی، قطب الدین محمد کے حصہ میں ورشان کی ولایت آئی، جہاں اس نے فیروزکوہ کا شہر بسایا، کچھ عرصہ بعد بھائیوں میں شکر رنجی پیدا ہوئی اور ملک قطب الدین محمد روٹھ کر غزنین چلا گیا، یہ بہرام شاہ (۵۱۱ھ ۵۴۷ھ) کا زمانہ تھا، قطب الدین محمد نے جو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی آراستہ تھا، اپنی جود و سخا سے بہت جلد غزنین میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس پر حاسدوں نے بہرام شاہ کے کان بھرنا شروع کیے کہ

"بنظر خیانت بجرم پادشاہی می نگرد و اموال بذل می کند تا بر پادشاہی خروج کند[1]"

اس لیے بہرام شاہ نے خفیہ طور پر اسے زہر دلوا دیا، جب یہ خبر غور پہنچی تو سلطان سوری غور کو دوسرے بھائی سلطان بہاء الدین سام (جو غیاث الدین اور شہاب الدین غوری کا باپ تھا) کے سپرد کر کے لشکر جرار کے ساتھ بھائی کا انتقام لینے غزنی پہنچا، بہرام شاہ شکست کھا کر ہندوستان چلا گیا، مگر سردی کے موسم میں جب غور و غزنی کا درمیانی راستہ مسدود ہو گیا تو اہل شہر کے بلاوے پر غزنی واپس آیا، اور سلطان سوری اور اس کے وزیر سید مجد الدین موسوی کو ہرا کر ذلت و خواری کے ساتھ قتل کرا دیا، جب سلطان بہاء الدین سام کو اس کی اطلاع ملی تو غور کو تیسرے بھائی علاء الدین حسین کی نگرانی میں دے کر بھائیوں کا بدلہ لینے چلا، مگر راستہ ہی میں وفات پا گیا، اس کے بعد سلطان علاء الدین حسین لشکر جرار لیکر غور سے غزنی پہنچا، دونوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، بہرام شاہ کو شکست ہوئی، اور علاء الدین نے غزنی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، اسی لیے وہ تاریخ میں "سلطان علاء الدین جہاں سوز" کے نام سے مشہور ہے، اسی "جہانسوزی" کے نتیجہ میں غزنی کا مشہور کتب خانہ بھی جس میں بہت سی نادر و نایاب کتابیں تھیں،

---

[1] طبقات ناصری ص ۴۹

جل کرتباہ ہوگیا، انہیں نوادر میں شیخ بو علی سینا کی "الحکمۃ المشرقیہ" بھی تھی۔

سلطان علاء الدین نے اپنے بھتیجوں (یعنی سلطان بہاء الدین سام کے دونوں بیٹوں) غیاث الدین اور معز الدین (شہاب الدین محمد غوری) کو دحیرستان کے قلعہ میں قید کر دیا تھا، آخر زمانہ میں اس کا رجحان "اسماعیلیت" کی طرف ہو گیا تھا، اس سے رعایا میں اس کی ہر دلعزیزی کو صدمہ پہنچا، علاء الدین کی وفات پر اس کا بیٹا سلطان سیف الدین کے نام سے تخت نشین ہوا، اس نے باپ کی پالیسی کو بدل دیا اور اسماعیلی دعاۃ (قرامطہ) کی بیخکنی کی اور اس طرح رعایا میں مقبولیت حاصل کی، بقول منہاج سراج،

"و دین عزو سنت محمد محبت او در دل اہل غور و ممالک جبال راسخ گشت و جملگان نفاق عقیدت برمیان بستند و طوق طاعت او بر گردن اخلاص نہادند"[۱]

دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ دونوں چچا زاد بھائیوں غیاث الدین اور شہاب الدین کو قید سے آزاد کر دیا۔ سلطان سیف الدین نے ڈیڑھ سال کی مختصر حکومت کے بعد وفات پائی اور غیاث الدین اس کا جانشین ہوا، غیاث الدین نے شہاب الدین کو تکیناباد (مضافات غزنی) کی حکومت دی، اسکے بعد ۵۶۹ھ میں دونوں بھائیوں نے غزنی پر حملہ کیا جسے غز نے ۵۵۰ھ میں خسرو شاہ سے چھین لیا تھا، بڑی گھمسان کی لڑائی کے بعد غوریوں کی فتح ہوئی اور بقول منہاج سراج:

"چوں غزنیں فتح شد سلطان غیاث الدین برادر خود سلطان معز الدین را بر تخت محمودی بنشاند"[۲]

"تخت محمودی" پر متمکن ہونے کے بعد "ملک محمودی" کی خواہش فطری تھی، اسلئے اگلے سال محمد غوری نے گردیز کو فتح کیا، ۵۷۱ھ میں ملتان کو قرامطہ سے چھینا جو غزنویوں کی کمزوری کی وجہ سے وہاں متمکن ہو گئے تھے، ۵۷۴ھ میں گجرات پر حملہ کیا مگر ناکام لوٹا، ۵۷۵ھ میں پشاور فتح کیا لیکن جب تک محمود کا خاندان "محمودی" برسر اقتدار تھا، ملک "محمودی" کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلئے ۵۷۷ھ میں اس نے لاہور پر جو آخری غزنوی تاجدار خسرو ملک کا مستقر اور دار الحکومت تھا حملہ کیا۔

"چوں کار دولت محمودیاں بآخر رسیدہ بود و تراجع در دولت آں دودمان واپس شدہ خسرو ملک بطریق صلح پسر را و یک زنجیر فیل بخدمت سلطان غازی فرستاد"[۳]

---

۱ طبقات ناصری ص ۷۵، ۲ ایضاً ص ۷۳، ۳ ایضاً ص ۱۱۶

اس مرتبہ محمد غوری صلح کر کے لوٹ گیا، اگلے سال دیول (سندھ) کو فتح کر کے مال غنیمت لیکر لوٹا، ۵۸۰ھ میں پھر لاہور پر حملہ کیا اور ملک کو تاخت و تاراج کر کے لوٹ گیا، لوٹتے وقت سیالکوٹ میں ایک قلعہ بنا کر حسین خرمیل کو وہاں متعین کر گیا اسوقت غزنوی خاندان کا ستارہ غروب ہو رہا تھا۔ اسکے اسباب بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے، خسرو ملک نے ہندستانی لشکر کے ساتھ سیالکوٹ پر چڑھائی کی، مدت تک محاصرہ کیے پڑا رہا، آخر ناکام لوٹ گیا، اور محمد غوری کو لاہور پر حملہ کرنے اور غزنویوں کو ختم کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا اور :

"چوں دولت محمود بالآخر انجامیدہ بود و آفتاب دولت و سلطنت سبکتگین بغروب رسیدہ و دبیر قضا پروانۂ عزل خسرو ملک در قلم تقدیر آوردہ، خسرو ملک طاقت مقاومت نداشت، بوجہ صلح پیش آمد تا با سلطان ملاقات کند، بیرون آمد، ماخوذ و محبوس گشت و لوہور سلطان غازی را مسلم شد[1]"

سلطان نے علی کرماخ کو لاہور کا گورنر اور منہاج سراج کے والد سراج الدین کو قاضی لشکر مقرر کیا،

پچھلے حملہ آوروں کی طرح محمد غوری کو کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ہندستان میں شوق جہاد پورا کرنے جائیگا، بلکہ وہ صرف خاندانی انتقام کی تشفی کے لیے غزنویوں کو انکے خراسانی مقبوضات کے ساتھ ساتھ ہندستانی مقبوضات سے بھی بے دخل کرنے آیا تھا، مگر مقامی راجاؤں نے اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہا، ہوا یہ کہ سلطان نے نئی مملکت کی سرحد کو مضبوط کرنے کے لیے قلعہ تبرہندہ (سرہند) کو فتح کر کے ملک ضیاء الدین تولکی کو وہاں کا نائب بنا کر خود غزنی جا رہا تھا کہ پرتھوی راج اور اس کے بھائی کھانڈے راؤ (یا بقول منہاج سراج گوبند رائے[2]) نے جمعیت کثیر کے ساتھ حملہ کر دیا، اور سلطانی فوج کو شکست ہوئی، اس لیے سلطان نے ۵۸۸ھ میں پھر حملہ کیا اور اس شکست کا بدلہ لے لیا، اور اجمیر اور دہلی بھی غوریوں کے قبضہ میں آگئے۔ اور اسلامی حکومت کا مرکز بن گئے، حسن نظامی نے "تاج المآثر" میں لکھا ہے کہ فتح کے بعد اجمیر مساجد و مدارس سے معمور ہو گیا۔

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۱۷ [2] ایضاً ص ۱۱۹

"اساس و قواعد آنکہ بانقص و خرابی پذیرفت و محل اصنام و اوثان بمساجد و مدارس بدل افتاد"[۱]

اس کے بعد سابق حملہ آوروں کی طرح غوریوں کو بھی مقامی راجاؤں کی قوت کا اندازہ ہوگیا، چنانچہ انہوں نے شمالی ہندوستان کو اپنی تاخت و تاراج سے روند ڈالا۔ اگلے سال محمد غوری کے نائب قطب الدین ایبک نے میرٹھ اور کول کو فتح کر کے دہلی کا باقاعدہ انتظام کیا، سنہ ۵۹۰ھ میں محمد غوری نے قنوج اور بنارس پر حملہ کر کے غنیمت فراواں حاصل کی، اور اس کے حکم سے قطب الدین ایبک نے گجرات اور شمالی ہندوستان کے اکثر حصے فتح کر کے ممالک محروسہ میں شامل کیے

سنہ ۵۹۷ھ میں تکش خاں بادشاہ خوارزم کی وفات پر غیاث الدین اور شہاب الدین نے خراسان پر حملہ کیا اور نیشاپور و سرخس وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ غیاث الدین تو لوٹ کر ہرات چلا گیا۔ مگر

"سلطان شہاب الدین بہ نیت تخریب بلاد و قلاع و رباع ملاحدہ متوجہ قہستان شد"[۲]

وہاں پہنچ کر اس نے اسماعیلیوں کی بیخ کنی شروع کر دی، ان کے شہروں کو ان سے خالی کر کے از سر نو اسلامی شعائر کو قائم کیا۔ بقول ابن الاثیر

فاقام بہا الصلوٰۃ وشعائر الاسلام[۳]	سلطان نے وہاں نماز اور دیگر شعائر اسلام کو قائم کیا۔

والی قہستان نے غیاث الدین سے [جس کے مزاج میں شہاب الدین کی طرح تشدد نہیں تھا] شکایت کی کہ یہ صلح کی خلاف ورزی ہے، غیاث الدین نے شہاب الدین کے پاس قاصد روانہ کیا جس نے اس کو اسماعیلیوں کو برباد کرنے سے روکا، اس پر سلطان شہاب الدین ناراض ہو کر بجائے غزنی کے ہندوستان روانہ ہوگیا۔[۴]

۱؎ تاج المآثر ۲؎ روضۃ الصفا ج ۴ ص ۳۰ ۳؎ و ۴؎ کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۷۰ ۱

۵۹۹ھ میں غیاث الدین کی وفات پر شہاب الدین مستقل بادشاہ ہوا، خوارزم شاہیوں سے جنگ جاری تھی جس میں محمد غوری کا پلہ بھاری تھا لیکن خوارزم شاہیوں نے کفار خطا سے دہائی دے کر مدد سے محمد غوری کو شکست فاش دی، یہاں تک کہ دوسرے ملکوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد غوری اس جنگ میں لاپتہ ہوگیا ہے، جس سے تمام ممالک محروسہ میں ابتری پھیل گئی، سلطان کا ایک غلام ایبک بال ملتان پہنچا، جہاں ایک فتنہ پرداز زندیق عمر بن ہزان کے اغواء سے علم خودمختاری بلند کیا، ملتان اور لاہور کے درمیان کھوکھروں نے بغاوت کردی، ادھر خراسان کے باطنیوں (اسماعیلیوں) نے سلطان کی اس پریشانی سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن سلطان نے ہمت اور حسن تدبیر سے کام لیا، ایبک بال ترکی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا، جس نے اس کا قلع قمع کرکے اس کو قتل کردیا، اور باطنیہ خراسان کے استیصال کے لیے اپنے نائب محمد بن ابی علی کو لکھا، اس نے قہستان سے جنکر قائن کا جو باطنیوں کا گڑھ تھا، محاصرہ کرلیا[1]، ادھر قطب الدین ایبک کو کھوکھروں کی تادیب کے لیے لکھا، اور خود کفار خطا سے انتقام لینے کی تیاریاں کرنے لگا، وہ ان سے بدلہ لینے[2] جا رہا تھا کہ کھوکھروں کی شورش کی پے درپے خبریں آنا شروع ہوگئیں، اور لاہور اور ملتان کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا، اس لیے مجبوراً کفار خطا سے انتقام کا ارادہ ترک کرکے عنان عزیمت ہندوستان کی طرف منعطف کی، ربیع الاول ۶۰۲ھ میں لڑائی ہوئی، کھوکھر بڑی بے جگری سے لڑے، مگر آخر کار شکست کھائی، ان کی تادیب سے فارغ ہوکر سلطان لاہور گیا، جہاں کچھ دن آرام کیا[3]، اب وہ پھر کفار خطا کی جنگ کے ارادے سے چلا، مگر راستے میں دمیک کے مقام پر ایک رات کچھ نامعلوم لوگوں نے خیمہ میں گھس کر اسے شہید کرڈالا[4]، ایک خیال یہ ہے کہ والی قہستان نے جس کے ملک پر سلطان کے حکم سے محمد بن ابی علی محاصرہ ڈالے پڑا تھا، کچھ فدائی سلطان کو شہید کرنے کے لیے بھیجے تھے، دوسرا خیال یہ ہے کہ

---

[1] کامل ابن الاثیر جلد ۱۲ ص ۷۲-۷۳، [2] ایضاً ص ۸۱-۸۲ [3] ایضاً ص ۸۳

یہ خوارزم شاہیوں کے ایجنٹوں کا کام تھا، جن کے استیصال کے لیے سلطان جا رہا تھا، خوارزمشاہی سلاطین اور امرا، وخلفاء کو بھی فدائیوں کے ہاتھوں ختم کرا چکے تھے۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اس سازش میں امام رازی بھی شریک تھے۔ یا کم از کم ان کو اس سازش کا علم تھا، کیونکہ امام صاحب خوارزم شاہ کے خاص آدمی تھے، اور وہاں (دمیک) سے بھاگ کر خوارزم شاہی کے دربار میں پہنچے تھے[۱]، اس کے علاوہ، وہ غالباً اسماعیلیوں کے وظیفہ یاب بھی رہے تھے، (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد اس کے ہندوستانی مقبوضات اس کے غلام قطب الدین ایبک کے حصہ میں آئے جس سے سلاطین ہند کے ایک نئے سلسلہ "غلام خاندان" کا آغاز ہوا۔

غور اور بامیان کا علاقہ قدیم زمانہ میں بدھ مت کے زیر اثر رہ چکا تھا، اور بت پرستی کے ساتھ تشبیہ وتجسیم ان کی طبیعت میں راسخ تھی، اس لیے اسلام لانے کے بعد "کرامیت" ان میں بہت زیادہ مقبول ہوگئی، غیاث الدین اور شہاب الدین بھی اپنے ہموطنوں کی طرح اسی مذہب کے پیرو تھے، منہاج سراج نے لکھا ہے:-

"در اول حال آں ہر دو برادر نور اللہ مرقدہما بہ طریق مذہب کرامیان بودند کہ اسلاف وبلاد خود"[۲]

اسی طرح ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ اہل غور کرامی تھے، اور اشاعرہ وشوافع کو خصوصیت سے ناپسند کرتے تھے:-

"واما الغوریہ فکلھم کرامیۃ ذکرھوہ"[۳]

لیکن جب خراسان غوریوں کے قبضہ میں آگیا تو غیاث الدین وشہاب الدین نے کرامی

---

[۱] روضۃ الصفا جلد چہارم صفحہ ۰۸ [۲] طبقات ناصری ص ۷۷ [۳] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۵۹

Marfat.com

مذہب چھوڑ دیا، ابن الاثیر نے لکھا ہے:۔

وقیل ان غیاث الدین واخاہ	اور کہا جاتا ہے کہ جب غیاث الدین اور
شہاب الدین لما ملکا فی	اس کا بھائی شہاب الدین خراسان پر
خراسان قیل لھما ان الناس	قابض ہو گئے تو ان سے لوگوں نے کہا کہ
فی جمیع البلاد یزرون علی	اس پورے ملک کے لوگ کرامیہ کو برا
الکرامیۃ ویحتقرونھم فالرای	سمجھتے اور حقیر گردانتے ہیں، اس لیے انکا
ان تفارقا مذھبھم فصارا	مذہب چھوڑ دینا مناسب ہے، چنانچہ
شافعیین[1]	دونوں شافعی ہو گئے،

غیاث الدین کے تبدیل مذہب میں دو شخصوں کو خاص دخل تھا :۔ ایک فخر الدین مبارکشاہ مروزی جو غوری دربار کا ایک باکمال فاضل، درباری مورخ اور "ہرات نامہ" کا مصنف تھا، دوسرے امام فخر الدین رازی۔ فخر مبارک نے اپنے ہموطن شیخ وجیہ الدین ابو الفتح محمد بن محمود المروزی کو دربار سلطانی میں باریاب کرایا، ان کی تعلیم و ترغیب سے غیاث الدین نے شافعی مذہب اختیار کر لیا، ابن اثیر لکھتا ہے:۔

فاوصل الی غیاث الدین	شیخ وجیہ الدین ابو الفتح محمد بن محمود مروزی
الشیخ وجیہ الدین ابا الفتح محمد	فقیہ شافعی کو غیاث الدین کے یہاں پہنچا گیا
بن محمود المروزی الفقیہ	انھوں نے اس کو مذہب شافعی سمجھایا
الشافعی فاوضح لہ مذھب	اور اس کے سامنے مذہب کرامیہ کی خرابیاں
الشافعی وبین لہ فساد مذھب	واضح کیں، چنانچہ غیاث الدین نے شافعی مذہب

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱۱ ص ۲۰۰ ، [2] طبقات ناصری ص ۷۷

الکرامیة فصار شافعیا وبنی المدارس	اختیار کرلیا اور یہاں شافعیہ کے لیے مدارس
للشافعیة وبنی بغزنة مسجدا لهم	قائم کیے اور غزنہ میں ایک مسجد تعمیر کی اور
لهم ایضا واکثر مراعاتهم فسعی	ان کے ساتھ بڑی رعایتیں کیں، اس لیے
الکرامیة فی اذی وجیه الدین	کرامیہ نے وجیہ الدین کو تکلیف پہنچانے
فلم یقدرهم الله تعالی	کی بڑی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے
علی ذالک[1]	ان کو اس پر قادر نہیں کیا،

منہاج سراج نے سلطان کے تبدیل مذہب کی مزید تفصیل دی ہے،

"ان سلطان غیاث الدین نور اللہ مرقدہ شبے در خواب دید کہ او با قاضی وحید الدین (وجیہ الدین؟) محمد مروروذی طاب ثراہ کہ بر مذہب اصحاب حدیث بود و معتمد ایشان بود در یک مسجد بودندے ناگاہ امام شافعی رحمہ اللہ درآمد و در محراب رفتے و تحریمۂ نماز بہ بستے و سلطان غیاث الدین و قاضی وجیہ الدین ہر دو با امام شافعی رحمہ اللہ اقتدا کردندے، چوں از خواب درآمد سلطان فرمان داد تا بامداد قاضی وجیہ الدین را تذکیر فرمودند، چوں بر بالائے کرسی رفت در اثنائے سخن گفت کہ اے بادشاہ اسلام این داعی دوش خوابے دیدہ است و عین خوابے کہ سلطان دیدہ بود بازگفت۔ و ہم مثل آن دیدہ بود کہ سلطان، چنانچہ از کرسی فرود آمد و بخدمت سلطان بالا رفت، سلطان طاب مرقدہ دست مبارک قاضی وجیہ الدین علیہ الرحمہ بگرفت و مذہب امام شافعی رحمہ اللہ علیہ قبول کرد[2]۔"

اس سے کرامی فرقہ کو بڑی تکلیف ہوئی، اس زمانہ میں ان کے سب سے بڑے مقتدا امام

---

[1] کامل ابن اثیر جلد دوازدہم ص ۹۰ [2] طبقات ناصری ص ۷۷ – ۷۸

امام صدر الدین علی ہیضم نیشاپوری تھے، جو غرجستان میں شہر دفشین کے مدرسہ کے صدر مدرس تھے، انھوں نے ایک منظوم شکایت نامہ لکھا، یہ قطعہ غیاث الدین کے پاس پہنچا تو وہ بہت ناراض ہوا، اور امام صدر الدین ممالک غور سے ہجرت کرکے نیشاپور چلے گئے، اور ایک سال کے بعد انھوں نے معذرت میں ایک قطعہ لکھ کر سلطان کے پاس بھیجا جس کا مطلع تھا،

جلالک حضرت تکو غوثنا دانت غیاث ۔۔۔ یمین عهدک تیسیر امرنا المثلثات

اس معذرت پر سلطان نے ان کے لیے خلعت بھیجی اور واپس بلا بھیجا،[1]

اسی زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ امام فخر الدین رازی جو عرصہ تک اسماعیلیوں کے وظیفہ یاب رہے تھے، (تفصیل آگے آرہی ہے) پہلے بامیان پہنچے، جہاں بہاء الدین سام غوری (جو غیاث الدین و شہاب الدین کے باپ اور ان کے علاوہ ایک اور غوری شہزادہ تھا) کی حکومت تھی، امام رازی نے اس کے نام پر رسالہ بہائیہ تصنیف کیا،[2] بامیان سے وہ سلطان غیاث الدین کے پاس پہنچے، سلطان نے ان کی بہت زیادہ عزت و تکریم کی، اور ہرات میں ان کے واسطے ایک مدرسہ تعمیر کیا، ان کی اس عزت و وجاہت سے کرامی علماء کو جن کی اس نواح میں اکثریت تھی بڑا دکھ ہوا، خود حکمراں خاندان کے اکثر ارکان کرامی تھے، ان میں ملک ضیاء الدین جو سلطان کا چچا زاد بھائی اور داماد تھا، پیش پیش تھا، ایک دن مجلس مناظرہ میں امام رازی نے کرامیوں کے پیشوا ابن القدوہ [قاضی مجد الدین عبد المجید ابن عمر] کو بہت برا بھلا کہا، ابن القدوہ نہ صرف کرامیوں ہی میں معزز و محترم تھا بلکہ دربار میں بھی اس کی بڑی عزت تھی، چنانچہ جب خلیفہ الناصر کے یہاں سے ابن الربیع سفارت پر آیا تو غیاث الدین نے ابن القدوہ ہی کو بار رسالت میں بغداد بھیجا تھا،[3] امام رازی کی اس زبان درازی سے لوگ بہت زیادہ برافروختہ ہوئے، ملک ضیاء الدین نے غیاث الدین سے جاکر شکایت کی اور امام رازی پر فلسفہ و زندقہ

---

[1] طبقات ناصری ص ۷۹، [2] ایضاً ص ۱۰۶، [3] ایضاً ص ۷۰،

کا الزام لگایا۔

وقام ضیاء الدین فی ھذہ	ضیاء الدین نے غیاث الدین سے اس واقعہ
الحادثۃ وشکی الی غیاث الدین	کی شکایت اور امام فخر کی بڑی مذمت
وذم الفخر ونسبہ الی الزندقۃ	کی اور زندقہ اور فلاسفہ کے مذہب کو
ومذھب الفلسفۃ[1]	ان کی جانب منسوب کیا،

سلطان غیاث الدین نے اس شکایت کی پروا نہ کی، دوسرے دن قاضی ابن القدوہ جامع مسجد میں پہنچے اور حمد وثنا کے بعد اتباع سنت اور فلسفہ سے بیزاری پر زور دیا:-

ایھا الناس انا لا نقول الا ما صح	لوگو ہم صرف وہی کہتے ہیں جو ہمارے نزدیک
عندنا عن رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے،
علیہ وسلم اما علم ارسطاطالیس	اور ارسطاطالیس کے علم، ابن سینا کی
وکفریات ابن سینا وفلسفۃ	کفریات، اور فارابی کے فلسفہ کو
الفارابی فلا نعلمھا[2]	ہم نہیں جانتے،

اس کے بعد امام رازی کے رویہ اور بدکلامی کی بڑے رقت آمیز لہجہ میں شکایت کی، اس سے لوگوں میں بڑا ہیجان پیدا ہو گیا، اور قریب تھا کہ یہ فتنہ قتل وخونریزی کی شکل اختیار کرلے کہ سلطان کو اس کی اطلاع ہوگئی، اس نے لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے خواص کو بھیجا اور امام رازی کے نکال دینے کا وعدہ کیا، اور امام رازی کو بھی کہلا بھیجا کہ وہ ہرات سے چلے جائیں، اس حکم پر وہ چلے گئے۔

لیکن ...... سلطان شہاب الدین غوری نے حنفی مذہب اختیار کیا تھا، ابن الاثیر نے لکھا ہے:

وقیل شہاب الدین کان حنفیا واللہ اعلم[3]	اور کہا جاتا ہے کہ شہاب الدین حنفی تھا،

---

[1] کامل ابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۹۵ [2] ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۱۰

Marfat.com

گر منہاج سراج نے تشنیت کے ساتھ لکھا ہے :۔

"السلطان معزالدین چوں بتخت غزنیں نشست واہل آں شہر و مملکت بر مذہب امام اعظم ابوحنیفہ کوفی رحمہ اللہ بودند او بموافقت ایشان مذہب ابی حنیفہ رحمہ اللہ اختیار کرد۔"[1]

یہ تبدیل مذہب فقہی سے زیادہ کلامی تھا، اس لیے علوم عقلیہ کی ترویج، اشاعت پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے،

علمی سرپرستی مسلمانوں کے لوازم سلطنت میں رہی ہے، اس لیے غوری حکمرانوں نے بھی اس رسم دیرینہ کا اتباع کیا، ابن الاثیر غیاث الدین کے بارے میں لکھتا ہے :۔

کان جوادًا حسن الاعتقاد	وہ فیاض اور صحیح العقیدہ تھا، خراسان میں
کثیر الصدقات والوقوف	بہت سے صدقات اور اوقاف کیے، مسجدیں
بخراسان بنی المساجد والمدارس	اور مدرسے بنائے جب وہ کسی شہر میں پہنچتا
..... وکان اذا وصل الی بلد عم	تھا تو اس کے باشندوں، فقہا اور اہل فضل
احسانہ اہلہ والفقہاء واہل	کے ساتھ عام احسان وسلوک کرتا تھا اور
الفضل ..... وکان یراعی کل	علوین اور شعراء وغیرہ میں سے جو بھی
من وصل الی حضرتہ من	اس کے حضور میں پہنچ جاتا تھا اس کے ساتھ
العلویین والشعراء وغیرہم	مراعات کرتا تھا، اس میں بڑی خوبیاں
وکان فیہ فضل غزیر وادب	اور محاسن تھے، حسن خط بلاغت
مع حسن خطہ وبلاغتہ "[2]	اور ادب سے آراستہ تھا،

اسی طرح منہاج سراج نے اس کی علم وفضل نوازی کے بارے میں لکھا ہے :۔

---

[1] طبقات ناصری ص ،، [2] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۸۰،

"حق تعالیٰ.... حضرت او را از افاضل علما، و جماہیر حکما، و مشاہیر بلغا آراستہ گردہ و درگاہ با جاہ او جہاں پناہ شدہ مرجع افراد مذکوران دنیا گشتہ از کل مذاہب مقتدایان ہر فریق جمع بودند و شعراء بے نظیر حاضر و ملوک کلام نظم و نثر در سلک خدمت بارگاہ اعلیٰ او منتظم"[1]

اسی طرح عوفی غوریوں کے پایہ تخت فیروزکوہ کے بارے میں لکھتا ہے:-

"حضرت فیروزکوہ محط رحال و مہبط انوار فضل و افضال شد، شعراء عالی قبلہ حاجات آنرا دانستند و فضلاء سامی مرتبت روے بداں آوردند۔"

غیاث الدین کے دربار کا سب سے مشہور فاضل فخر الدین مبارک شاہ تھا جس کے فضل و کمال اور مزاجِ سلطانی میں دخیل ہونے کا اوپر ذکر آ چکا ہے، ابن الاثیر اس کے بارے میں لکھتا ہے:-

یقول الشعر بالفارسیة متفننا فی کثیر من العلوم[2]	فارسی کا شاعر اور بہت سے علوم میں دستگاہ رکھتا تھا

فخر الدین مبارک شاہ نے اپنے مکان میں ایک مہمان خانہ بنایا تھا جس میں شائقین علم کے لیے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، ابن الاثیر دوسری جگہ لکھتا ہے:-

وكان حسن الشعر بالفارسية	فارسی اور عربی میں اچھا شاعر تھا۔ غیاث الدین کبیر
والعربية وله منزلة عظيمة عند	والی غزنہ و ہراۃ وغیرہ کے دربار میں اس کی بڑی
غياث الدين الكبير صاحب غزنة	قدر و منزلت تھی۔ غیاث الدین کے مہمان خانہ
وهراة وغيرهما وكان له دار ضيافة	میں کتابوں اور شطرنج کا بھی انتظام تھا۔
فيها كتب وشطرنج فالعلماء يطالعون	علماء کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور جاہل
الكتب والجهال يلعبون بالشطرنج[3]	شطرنج سے دل بہلاتے تھے۔

فخر مبارک نے سلاطین غور کی منظوم تاریخ بھی لکھی تھی، جسے اس نے سلطان غیاث الدین کے نام معنون کیا تھا۔ منہاج سراج لکھتا ہے،

---

[1] طبقات ناصری ص ،، [2] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۹۰ [3] ایضاً ص ۹۴

"بدانکہ ملک الکلام مولانا فخر الدین مبارکشاہ مرو روذی طاب مرقدہ نسبت نامہ ایں سلاطین نامدار را در سلک نظم کشیدہ است ..... چوں بعضے از کتاب و تاریخ در نظم آمد مگر بسبب تغیر مزاجے کہ فخر الدین مبارکشاہ را ظاہر شد آں نظم را مہمل گذاشت تا چوں مملکت بشکوہ فرمایوں سلطان غیاث الدنیا والدین محمد سام زیب و جمال گرفت آں تاریخ بالقاب مبارک او مزین گشت و تمام شد"[1]

اس عہد کے دوسرے فضلا میں جمال الدین محمد بن نصر اور شرف الدین احمد بن محمد ایزدیار خاص طور سے مشہور ہیں، شہاب الدین غوری ایک حوصلہ مند فاتح تھا، اور علمی سرپرستی میں بھی دوسرے بھائی سے کم نہ تھا، ابن الاثیر اس کی علما نوازی کے بارے میں لکھتا ہے:-

حکی عنہ انہ کان یحضر العلماء	بیان کیا جاتا ہے کہ غیاث الدین علماء
فیتکلمون من المسائل الفقہیۃ	کو بلاتا تھا، وہ اس کے سامنے فقہی اور
وغیرہا وکان فخر الدین الرازی	دوسرے مسائل پر بحث کرتے تھے۔
یعظ فی دارہ[2]	فخر الدین رازی اسکے گھر میں وعظ کہتے تھے۔

اسی طرح بدایونی نے اس کی علم دوستی کے بارے میں لکھا ہے:-

"وعلماء و فضلاء و شعراء در زمان او بسیار تربیت یافتند۔ از اں جملہ امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ کہ لطائف غیاثی و کتب دیگر بنام نامی او سلطان غیاث الدین ابو الفتح تصنیف کردہ در لشکر سلطان معز الدین محمد سام اقامت داشتہ ہر ہفتہ بوعظ قیام می نمود و سلطان در پائے وعظ او رفتہ رقت بسیاری کرد..... روزے بر سر منبر با سلطان خطاب کردہ گفت کہ اے سلطان معز الدین بعد از چند گاہ نہ ایں عظمت و شوکت تو می ماند، نہ تملق و نفاق رازی۔ و ایں قطعہ انشاد نمود

اگر دشمن نسازد با تو اے دوست — ترا باید کہ با دشمن بسازی
وگرنہ چند روزے صبر فرما — نماند نہ تو نے فخر رازی[3]

---

۱ طبقات ناصری ص ۲۸-۲۹ ۲ کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۱۰۴ ۳ منتخب التواریخ بدایونی ج اول ص ۵۶

(معارف: جون ۱۹۶۳ء)

۷

غوری نائبین ہندوستان میں بھی علمی سرپرستی کی ان روایات کو اپنے ہمراہ لائے اور غور و غزنی کی طرح مفتوحہ علاقوں کو مساجد و مدارس سے معمور کر دیا، چنانچہ "تاج المآثر" میں حسن نظامی نے فتح اجمیر کے بعد لکھا ہے:۔

"اساس و قواعد تسمہا نقص و خرابی پذیرفت، بجای اصنام و اوثان مساجد و مدارس بدل افتاد"

اس علمی سرپرستی کے ساتھ غوریوں کے یہاں معقولات بالخصوص کلام، فلسفہ اور نجوم کا چرچا بھی تھا۔

۱۔ کلام۔ غوریوں کا وطنی و خاندانی مذہب کرامیت تھا، لیکن غیاث الدین کے زمانہ میں شافعیت کے ساتھ اشعریت بھی غور میں داخل ہوئی۔ اشعریت معتزلہ و فلاسفہ کی تنزیہ محض یا تعطیل اور حنابلہ و کرامیہ کی تشبیہ و تجسیم کے درمیان راہ وسط ہے۔ وہ جس طرح فلاسفہ کی تعطیل کی منکر ہے۔ اسی طرح کرامیہ کی تجسیم سے بیزار ہے۔ لہذا "تجسیم" کی تردید کے لیے کلامی مناظروں میں گرم بازاری پیدا ہونا فطری تھا۔

لیکن ان مناظروں کی گرم بازاری میں امام رازی کے غور آ جانے سے اور بھی شدت ہو گئی پہلے وہ بامیان میں بہاء الدین سام غوری کے دربار میں پہنچے۔ اور اس کے نام پر "رسالہ بہائیہ" مدون کیا۔

Marfat.com

منہاج سراج نے لکھا ہے :۔

"فی الجملہ حسن عاطفت آں پادشاہ در حق علمائے اسلام زیادت ازاں بود کہ در دائرہ تحریر گنجد،

علامۃ الدنیا فخر الدین محمد رازی رحمۃ اللہ علیہ رسالہ غیاثیہ باسم او تالیف کردہ و بنا بر غزنی دانست

و حمایت او بود"[1]

بامیان سے وہ غیاث الدین کے یہاں تشریف لے گئے جس نے ان کی بہت زیادہ عزت و تکریم کی اور ہرات میں ان کے واسطے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا، مگر ان کا زیادہ وقت فیروز کوہ میں غیاث الدین کے دربار میں گزرتا تھا، جہاں کرامیہ فرقہ کے پیشواؤں کے ساتھ ان کے مناظرے ہوا کرتے تھے، ان میں ایک مناظرہ کا ذکر اوپر آچکا ہے، ابن الاثیر نے جس انداز سے اس کی تفصیل دی ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک کلامی مناظرہ تھا، کیونکہ دوسرے دن ابن القدوہ نے امام رازی کی جو شکایت کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث ظواہر نصوص (جن سے کرامیہ "تجسیم" ثابت کرتے تھے) اور دقائق کلام (جنہیں وہ فلسفیانہ تدقیقات سے تعبیر کرتے تھے) کے تصادم کا تھا۔ اسی لیے قاضی ابن القدوہ نے کہا تھا:

"انا لانقول الا ما صح عندنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما علوم ارسطا طالیس

وکفریات ابن سینا وفلسفۃ الفارابی فلانعلمہا"[2]

ان اشارات سے مترشح ہوتا ہے کہ فیروزکوہ میں امام رازی کی وجہ سے علم کلام کی بڑی گرم بازاری ہو رہی تھی اور کرامیہ فرقے کے علماء اس کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا سمجھتے تھے۔

امام رازی کو کرامیوں کی شکایت پر فیروزکوہ چھوڑ کر ہرات جانا پڑا، مگر اس سے علم کلام کی گرم بازاری میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ جہاں بھی رہے علم کلام پر کتابیں لکھتے رہے، جن میں سے بہت سی انہوں نے غیاث الدین غوری کے نام معنون کی تھیں، بدایونی نے لکھا ہے :۔

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۰۰ [2] کامل لابن الاثیر ج دوازدہم ص ۵۹

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہ لطائف غیاثی و کتب دیگر بنام برادر سلطان غیاث الدین ابو الفتح تصنیف کردہ[1]

غیاث الدین کی وفات پر جب سلطان معز الدین (شہاب الدین) محمد غوری بادشاہ ہوا تو اس نے بھی امام رازی کی عزت و احترام کو برقرار رکھا۔ وہ اس کے مزاج میں اس قدر دخیل تھے کہ اکثر وعظ میں یہاں تک کہہ دیا کرتے کہ

"اے سلطان معز الدین بعد از چند گاہ نہ ایں عظمت و شوکت تو می ماند نہ تملق و نفاق رازی"[2]

امام رازی کا قیام محمد غوری کے لشکر ہی میں رہتا تھا۔ اور اسی لیے جب سلطان کھوکھروں کی تادیب کے لیے ہندوستان آیا تھا تو وہ بھی یہاں آئے، اور جب دمیک کے مقام پر سلطان نے شہادت پائی تو وہ لشکر سلطانی ہی میں تھے، اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

ب۔ فلسفہ: اسلامی ممالک میں فلسفہ کو علی الاعلان کوئی مقبولیت نہ تھی اور فلسفی و باطنی اور اعدامی و نراجی ([illegible]) مترادف لفظ سمجھے جاتے تھے۔ باطنی جہاں جاتے سیاسی ترگلیند کے ساتھ فلسفہ کی تعلیمات کی بھی اشاعت کرتے رہے، غور میں وہ لوگ سلطان علاء الدین جہاں سوز کے عہد حکومت میں آئے تھے، سلطان نے ان کی بڑی آؤبھگت کی اور اس طرح انھیں غوریوں کی قلمرو میں دعوتی سرگرمیوں کا موقع مل گیا۔ منہاج سراج نے لکھا ہے:

و بآخر عمر رسل ملاحدہ الموت بنزدیک سلطان علاء الدین آمدند و ایشاں را اعزاز کرد و بہر جا از مواضع غور بسر دعوت کردند، و ملاحدہ الموت طمع بضبط و انقیاد اہل غور دربستند، ایں معنی غبارے نامی شد بر ذیل دولت علاء الدین[3]

لہذا جب اس کا بیٹا سلطان سیف الدین تخت نشین ہوا تو اس نے باطنیوں کا قلع قمع کر کے اہل

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی، جلد اول ص ۲۱ [2] ایضاً ص ۵۵ [3] طبقات ناصری ص ۶۳

بدنامی کے داغ کو دور کیا۔ منہاج سراج نے آگے چل کر لکھا ہے:-

"و این رسل از ملاحدہ الموت آمدہ بودند و در سر ہر کس را بیابان و بدعت و ضلال دعوت می کردند از طلب فرمود جملہ را فرمان داد تا زیر تیغ آوردند و ہلاک کردند و بہر موضعے کہ از ورم این فتنہ ایشان بوئے یافت فرمان داد تا در کل بلاد ممالک کشتی کردند و ہمہ را بہ دوزخ فرستادند و ساحت ممالک ہند را کہ معدن دینداری و شریعت پروری بود از لوث خبث قرامطہ بہ تیغ طہارت داد و بدین غزو پسندیدہ محبت او در دل اہل غور و ممالک جبال راسخ گشت و ہمگنان نطاق عبودیت بر میان بستند و ربقہ طواعیت او بر گردن اخلاص نہادند"۔[1]

الموت کے اسماعیلی فرمانروا حسن بن محمد کے عہد حکومت کا واقعہ ہے جو علی ذکرہ السلام کے نام سے مشہور تھا، اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن حسن اس کا جانشین ہوا، وہ اسماعیلیت میں غلو کے ساتھ علوم معقولات میں بھی دستگاہ رکھتا تھا، روضۃ الصفا میں ہے:

"و این محمد در کیش ضلالت از پدر غالی تر بود و در دعوی امامت مجد تر بغیر ادعائے حکمت علم فلسفہ کردے بلکہ در ان فن و سد فنون خود را منفرد پنداشتے و در علم تمام معقولہ فروع و اصول از سخنان وسے روایت بسیار کردندے"۔[2]

کہا جاتا ہے کہ الحاد و زندقہ کی اشاعت کے لیے اس نے بالکل ہی دوسری پالیسی اختیار کی اور اس کام کے لیے امام رازی کو منتخب کیا۔ صاحب روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ امام رازی محمد بن حسن کے زمانہ میں آذربائیجان گئے، وہاں سے لوٹ کر رے میں اقامت اختیار کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، اس سے لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ امام صاحب نے ملاحدہ کی دعوت کو قبول کر لیا ہے بلکہ ان کے داعی ہیں یا امام رازی نے اس تہمت سے برأت کے لیے بر سر منبر اسماعیلیہ کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ جا کہ الموت

---

[1] طبقات ناصری ص ٦٥ [2] روضۃ الصفا جلد چہارم ص ٩٠

Marfat.com

محمد بن حسن کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے ایک فدائی امام صاحب کے پاس بھیجا، وہ عرصہ تک امام صاحب کا شاگرد رہا، ایک دن تنہائی میں موقعہ پاکر امام رازی کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور چھرا نکال لیا، امام رازی نے وجہ پوچھی تو کہا کہ تم ہم پر لعن طعن کرتے ہو۔ امام رازی نے اس سے توبہ کی اور آیندہ خاموش رہنے کا عہد کیا۔ فدائی امام صاحب کے سینہ سے اترا اور کہا کہ امام محمد بن حسن آپ کو سلام کہتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ قلعہ میں تشریف لے چلیں، امام صاحب نے معذرت کی تو اس نے ۳۰۰ دینار سرخ ان کی نذر میں پیش کیے اور کہا ہر سال اتنی ہی رقم آپ کو میں ابوالفضل (حاکم سجستان) سے دلا دیا کروں گا ان کے بعد وہ تو غائب ہو گیا۔ امام صاحب چار پانچ سال رے میں رہے اور اسماعیلیوں سے وظیفہ وصول کرتے رہے۔ اس کے بعد غور پہنچے، جہاں غیاث الدین اور شہاب الدین کے دربار میں رہے۔ شہاب الدین کے قتل کے بعد خوارزم بھاگ گئے، جہاں سلطان خوارزم شاہ کے دربار میں رہے۔[۱]

بہر حال امام صاحب جہاں بھی رہے ان پر اسماعیلی داعی ہونے کا شبہ کیا۔ بلاد رے کے زمانۂ قیام میں بحسب تصریح روضۃ الصفا مشہور تھا:

"امام دعوت ملاحدہ را قبول کردہ بلکہ یکے از دعات ایشان شدہ"[۲]

غور پہنچے تو ان کے متعلق یہی مشہور تھا، چنانچہ قاضی ابن القدوہ سے تلخ مناظرہ کے بعد جب ملک ضیاء الدین نے سلطان غیاث الدین سے جا کر ان کی شکایت کی تو حسب تصریح ابن الاثیر

شکی الی غیاث الدین و ذم الفخر	غیاث الدین سے شکایت اور فخر الدین رازی
ونسبه الی الزندقة و مذهب	کی مذمت کی اور ان کو زندقہ اور مذہب
الفلسفة[۳]	فلاسفہ کی جانب منسوب کیا۔

دوسرے دن جب قاضی ابن القدوہ نے جامع مسجد میں جا کر عوام سے شکایت کی تو در پردہ امام رازی

[۱] روضۃ الصفا ج ۴ ص ۸ [۲] ایضاً ص ۸۰ [۳] کامل لابن الاثیر ج ۱۲ واقعات ۹۵ھ

کو فلاسفہ کی تعلیمات کی اشاعت کے ساتھ متہم کیا :-

وما تاه ارسطاطالیس وکفریات ابن سینا وفلسفة الفارابی فلا نعلمها [1]

ارسطاطالیس کا علم، ابن سینا کے کفریات اور فارابی کے فلسفہ کو ہم نہیں جانتے۔

اور جب دمیک کے مقام پر شہاب الدین غوری کی شہادت ہوئی تو بھی امام صاحب کے متعلق اسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام رازی نے کلام کے ساتھ فلسفہ کی ترقی میں بھی بہت زیادہ حصہ لیا۔ انھوں نے شیخ کی دو مشہور کتابوں "اشارات" اور "عیون المسائل" کی شرحیں لکھیں، ہندسہ میں بھی ان کی کتابیں ہیں اور نجوم میں تو ان کی کتاب "سر المکتوم" کا ان کو بدنام کرنے کے لیے اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ امام رازی کی وجہ سے ممالک غور اور غوری مقبوضات میں فلسفہ کی بڑی گرم بازاری ہوئی،

لیکن ملاحدہ باطنیہ کی سرگرمیاں صرف غور ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ غزنوی حکمرانوں کے کمزور پڑ جانے کے بعد قرامطہ نے ملتان کو پھر فتح کر لیا تھا اور ان ہی قرامطہ سے سلطان شہاب الدین غوری نے اسے ۵۷۱ھ میں فتح کیا، منہاج سراج نے لکھا ہے :-

"و سیم سال بر سمت ملتان لشکر کشید و از دست قرامطہ ملتان را مستخلص کرد"[3]

اس طرح ہندوستان میں پھر قرامطہ کی دعوتی سرگرمیاں اپنی فلسفہ بندی کے ساتھ رائج ہو گئیں مگر سلطان شہاب الدین غوری کی فتح ملتان سے ان دعوتی سرگرمیوں کا خاتمہ نہیں ہوا، کیونکہ ان ہی اسماعیلیوں کے فدائیوں کے ہاتھ سے سلطان کی شہادت ہوئی مگر یہ سرگرمیاں بعد میں پورے

---

[1] کامل لابن الاثیر جلد دوازدہم ص ۵۹ [2] ایضاً ص ۸۳ [3] طبقات ناصری ص ۱۱۶

ہندوستان میں پھیل گئیں، چنانچہ رضیہ سلطانہ کے عہد میں قرامطہ نے نور ترک کے ہمراہ دہلی میں بلوہ کیا اور سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا۔[1]

غرض ملاحدہ کی دعوتی سرگرمیوں اور امام رازی کی کلامی مساعی کے ضمن میں فلسفہ و معقولات کی نہ صرف غور بلکہ غوریوں کے ہندوستانی مقبوضات میں بھی گرم بازاری جاری رہی۔

ج۔ نجوم:- غور نجوم کی ترقی کے لیے بھی قدیم زمانہ سے مشہور تھا۔ غوریوں کے اسلاف میں امیر عباس بن شیث بن محمد بن سوری جو غزنوی سلطان ابراہیم (۴۵۱ھ - ۴۹۲ھ) کا ہمعصر تھا، اپنے ظلم و تعدی کے ساتھ نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتنا و اہتمام کے لیے بھی مشہور تھا۔ منہاج سراج نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

"او باین ہمہ ظلم و تعدی از علم نجوم نصیب کامل داشت و دراں نوع رنج بسیار بردہ بود و در تحصیل آں علم جد و جہد وافر نمودہ و حظ کامل حاصل کردہ و در ولایت مندیش بخط منکہ آں قلعہ ملک را کہ سطام ضحاک بنا کردہ بود تجدید آں عمارت فرمان داد۔ و استادان کامل از اطراف حاصل کرد و دیوارہا برہم پارہ ازاں قلعہ برد و بطرف شیخ کوہ زار برغ برکشید و دربائے آں کو بربالائے تلی قصر بلند بنا فرمود۔ و دوازدہ برج و در ہر برجے بصورت برجے از فلک سی دریچہ نہادہ شش برج شرقی و شمالی و شش برج غربی و جنوبی۔ و بر ہر برجے بصورت برجے از فلک منگاشت و وضع آں چناں کرد کہ ہر روز خورشید از یک دریچہ بنسبت آں دریچہ کہ مطلع آں بودے در تافتے چنانچہ او را معلوم گشتے کہ آں روز آفتاب در کدام درجہ از کدام برج است۔"[2]

بعینہ اسی قسم کی رصدگاہ دو سو سال بعد محقق طوسی نے مراغہ میں ہلاکو کے حکم سے تعمیر کی تھی

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۸۹ [2] ایضاً ص ۴۳

Marfat.com

حبیب السیر" میں ہے :-

"خواجہ نصیر الدین .... در جانب شمالی مراغہ بر زبر پشتہ رفیع بر بنا رصد خانہ

اشتغال نمود مشتمل بر ثمانین اشکال افلاک .... و بر دخ دوازدہ گانہ۔

و آں رصد بر وجہے ساختہ و پرداختہ شد کہ ہر صباح پر و نیر اعظم از ثقبہ قبہ بالا بر سطح

عتبہ می افتاد و درج و دقائق حرکت وسط آفتاب ..... از انجا معلوم می گشت"[1]

رصد گاہ مراغہ محقق طوسی کی جدت کا کارنامہ ہے، مگر یہ اسی انداز پر مبنی تھی جس پر امیر عباس نے

پانچویں صدی میں اپنی رصدگاہ بنائی تھی، اس سے نجوم و ہیئت میں اس کی حذاقت اور کمال کا

اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ منہاج سراج نے اس رصدگاہ کا ذکر کرنے کے اور اس کی

حذاقت فنی کے بارے میں لکھا ہے :-

"و آں وضع دلیل است بر حذاقت و استادی امیر عباس در نجوم"[2]

بعد میں غور میں امیر عباس جیسا حاذق ہیئت داں نہیں ہوا، اس لیے وہاں کی تاریخ

میں ہیئت و نجوم کے ساتھ کسی کے اعتنا کا ذکر نہیں ملتا لیکن جہاں ایسے باکمال رہ چکے ہوں

وہاں سے ان فنون کا بالکلیہ جنس کا سد ہو جانا مستبعد ہے۔

بہرحال غوری فاتحین اپنے ہمراہ ہندوستان میں نئی منقولات کی ان قدیم روایت کو

لیکر آئے تھے۔ مگر اس عہد کے باکمالوں کا کوئی مستقل تذکرہ نہیں ملتا۔ صرف ان ہی لوگوں کا

نام تاریخ و تراجم کی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے جو شاعر بھی تھے، اس قسم کے فضلاء کو ایک

مختصر تذکرہ عوفی نے لباب الالباب میں دیا ہے، اس نے غوریوں کے پایۂ تخت

فیروزکوہ کے بارے میں لکھا ہے:

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو اول ص ۵۹ [2] طبقات ناصری ص ۳۴

Marfat.com

"حضرت فیروزکوہ بمخیم زوال و مہبط انوار فضل و افضال شد، شعرای عالی قبلۂ حاجات خود آنجا دانستند و فضلای سامی مرتبت رای بدان آوردند"[1]

ان فضلائے سامی میں شعراء کے علاوہ انواع علوم معقول و منقول کے ماہرین بھی تھے جیسے امام مجد الدین پسر امام ظہیر الدین فخر الزہاد محمد بن عبد الملک جرجانی جن کے بارے میں عوفی لکھتا ہے:-

"و امروز خطۂ لاہور بمکان فضل و بزرگی امیر امام مجد الدین کہ ثمرۂ آن شجرہ و فرع آن بحر است معمور است و تصانیف او در انواع علم از معقول و منقول مشہور است"[2]

ان عبارتوں سے اس عہد کے ہندوستان میں حکمت و معقولات کی گرم بازاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

[1] لباب الالباب عوفی جلد اول ص ۱۲۲ [2] ایضاً ص ۲۳۱

(معارف: جولائی ۱۹۶۳ء)

محمد بن تغلق کی فلسفہ پرستی

محمد بن تغلق کی عقلیت پرستی اور تفلسف پسندی تاریخ کا ایک مشہور و معروف واقعہ ہے۔ ہمعصر مورخین اور سیاحوں نے اس کی جو تفصیلات دی ہیں، ان کے پیش نظر اس "معقولات و فلسفہ" کی نوعیت میں کوئی ابہام نہیں رہ جاتا جس میں اس کو اس درجہ توغل و انہماک تھا لیکن عہد حاضر میں اس جانی پہچانی حقیقت کی نئی توجیہات و توضیحات پیش کی گئی ہیں، جو تاریخ افکار کے ماہرین کے لیے نئی دعوتِ فکر و نظر ثابت ہوں گی۔

مثلاً ابن بطوطہ نے اپنے "سفرنامہ" میں جہاں سلطان تونس کے "اشتغال علمی" کا ذکر کیا ہے کہ روزانہ بعد نماز فجر اس کے یہاں علمی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں، اور جن میں وہ بنفس نفیس حصہ لیا کرتا تھا، وہیں اس نے دوسرے ممالک اسلامیہ کے سلاطین کے علمی اشتغال بھی قلمبند کیے ہیں، اور لکھا ہے کہ میں نے بادشاہ ہند کے یہاں نماز فجر کے بعد خاص طور سے "علوم معقولات" کے مذاکرہ کا رواج دیکھا ہے۔

"فقد رأیت ملک الهند یتذاکرین یدیه بعد صلوٰة الصبح فی العلوم المعقولات خاصة" (رحلہ ابن بطوطہ مطبوعہ قاہرہ المجلد الثانی ص ۲۲)

ابن بطوطہ کی اس یادداشت پر جناب ڈاکٹر آغا سید مہدی حسین صاحب یو جی سی ریسرچ اسکالر

Marfat.com

نے حسب ذیل تبصرہ فرمایا ہے :-

"سفرنامہ ابن بطوطہ میں ان فلسفیوں کے نام کی صراحت نہیں ہے جن کے ساتھ بادشاہ فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا لیکن یہاں وہاں حوالوں کی بھی کمی نہیں ہے"[۱]

ان جستہ جستہ حوالوں کی توضیح میں جناب ڈاکٹر صاحب نے حاشیہ میں "سفرنامہ ابن بطوطہ" کے "ذکر السحرۃ الجوکیۃ" کی حسب ذیل عبارت کا حوالہ دیا ہے :-

وھؤلاء الطائفۃ تظھر منھم عجائب ...... یخبرون باموٗ مغیبۃ والسلطان یعظمھم ویجالسھم	اور ان لوگوں سے عجیب غریب خارق عادات امور ظاہر ہوتے ہیں ... پوشیدہ باتوں کی خبر دیا کرتے ہیں اور بادشاہ انکی بہت زیادہ عزت و تکریم کیا کرتا ہے اور اپنی ہم نشینی کے شرف سے نوازتا ہے
(رحلہ ابن بطوطہ ص ۱۲۳)	

آگے چل کر فرماتے ہیں :-

اور ان حوالوں کو اگر فتوح السلاطین کے متعلقہ اشعار نیز بادشاہ نے اپنی خود نوشت سوانح میں جو اعترافات کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جائے تو ان فلاسفہ کی شخصیت کے بارے میں کوئی شک نہیں رہتا۔" (انگریزی ترجمہ ابن بطوطہ صفحہ ۲۶۶)

لیکن فتوح السلاطین کے جن اشعار (۱۱۲۳۹ - ۱۱۲۴۲) کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے ان میں ہندو جوگیوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے ساتھ مجالست اور خلوت گزینی کا تو کیا ذکر ہے بلکہ صرف دین اسلام کی زبوں حالی اور غیر مسلموں کی چیرہ دستی کا شکوہ ہے :-

شدہ ضبط ہند و سراسر دیار مسلماں چو ہندو خزاں در جفا۔

۱۔ انگریزی ترجمہ رحلہ ابن بطوطہ از ڈاکٹر آغا سید مہدی حسین صاحب صفحہ ۲۶۶

Marfat.com

بگشتہ ہمہ ملک گجرات ہم | درو کفر افزون و اسلام کم

ہم آخر چو ظلم شہ از حد گذشت | ہمہ ملک مرتبہ از و نیز گشت

خروجے بکردند با شاہ دول | کہ در کفر دیدند میلش فزول

میرے پیش نظر "فتوح السلاطین" کا جو اڈیشن ہے اسے خود جناب ڈاکٹر صاحب کی تحریر و ترتیب کے مطابق جولائی ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا تھا، ممکن ہے آگرہ کا کوئی اور اڈیشن ہو، ویسے ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ حاشیہ (۲) میں فرمایا ہے کہ

"عصامی نے سلطان پر اسلام سے منحرف ہونے کی بنا پر بڑی سختی سے نکیر و گرفت کی ہے وہ اس کے خلاف عوام کو بغاوت پر بھڑکاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مسلم آزاری میں ہمنوا ہو گیا ہے۔ نیز خلوت میں ہندو فقرا کے ساتھ ملتا جلتا ہے اور دل میں کافر ہو گیا ہے"

ان میں سے بعض باتیں عصامی نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد والے اڈیشن کے صفحہ ۴۹۱ (ابیات ۹۶۳۷ - ۹۶۶۴) پر کہی ہیں۔ بالخصوص وہ اس کی ہندو نوازی اور جوگیوں کے ساتھ خلوت گزینی کے بارے میں لکھتا ہے:-

ز آئین اسلام سر تافتہ | ابا زمرۂ کفر در یافتہ

بر انداختہ رسم بانگِ نماز | شب و روز با زد اہل دین در گداز

جماعت بجمعہ در انداختہ | ابا ہندواں ہولیے باختہ

ابا جوگیاں گشتہ خلوت گرا | بدل راہ کفار را دادہ جا

لیکن خود فاضل محقق کو عصامی کے تشدد کا اعتراف ہے، نیز اس بات کا کہ ساری نکیر و گرفت رائے عامہ کو بادشاہ کے خلاف آمادہ خروج و بغاوت کرنے کے لیے تھی۔[1]

---

[1] Isami is more outspoken. He denounces Sultan Mohammad as Kafir and urges a general revolt against him. He censures him for siding with the Hindus and for mixing privately with the Jogis. (Rise and fall of Mohammad bin Tughlaq. PP.174-175)

اس کے بعد یہ بات کہ عصامی کی یہ شہادت اس اہم مسئلہ میں کہاں تک مفید ہو سکتی ہے، کسی مزید تبصرہ کی محتاج نہیں رہتی۔ بایں ہمہ وہ بڑے تیقن کے ساتھ فرماتے ہیں:-

"علماء سے مایوس ہو کر اس نے ہندو فلسفیوں سے رجوع کیا اور انھیں اپنے دربار میں بڑے عزت و احترام سے بلایا۔" (انگریزی ترجمہ ابن بطوطہ ص ۲۶۶)

اس قیاس آرائی کی تائید میں انھوں نے محمد بن تغلق کی "خود نوشت سوانح عمری" کی حسب ذیل عبارت کا ترجمہ دیا ہے۔

"و علماء روزگار بحکم الضرورات تبیح المحظورات بعضے زبان از گفتن حق بستہ بودند و ناکسان حرص دست شر از آستین بے دینی کشیدہ و بطمع مناصب باطل بآں گروہ ہم داستان گشتہ واز ایں سبب علوم دین از میان امت برخاستہ۔ اما چوں مردم بالطبع طالب علم اند بعض بے طلب علم قرار نمی یافت۔ اتفاقاً با طائفہ از متفلسفہ بزعم آنکہ محق اند محافظت (؟ مخالطت) افتاد۔"

یہ استشہاد کہاں تک جناب ڈاکٹر صاحب کی قیاس آرائی کا موید ہو سکتا ہے، اسکی تفصیل کا یہاں محل نہیں ہے۔ مگر انھوں نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ ہمعصر ماخذ و مصادر کے بجائے عہد حاضر کی چند غیر متعلق تصنیفات پر غیر مشروط اعتماد کر کے ان "فلاسفہ" کے ناموں کی تفصیل بھی دیدی، فرماتے ہیں:-

"یہ فلاسفہ جن پربھ سوری، جن دیو سوری، بسنا کرتی اور دوسرے نفرا اور جوگیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھے جن کا بیکانیر کے کھرتار گچا معاصر نظموں میں ذکر ہے۔"

اگرچہ خود انھیں ان نظموں کے متعلق یقین ہے کہ

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

Marfat.com

پھر بھی وہ ان کے مندرجات و مضامین پر اس درجہ اعتماد کرتے ہیں کہ اس کے بعد انھوں نے متقدمین و متاخرین کی تصریحات تک کو درخورِ اعتنا سمجھنے کی زحمت نہیں فرمائی، مقامی اور بیرونی تحریکات کے سیاق سباق میں اس قیاس آرائی پر نظرِ ثانی کرنے کا تو ذکر ہی کیا۔

یہ صورت حال ۱۹۵۱ء میں تھی جب کہ وہ رحلہ ابن بطوطہ کا انگریزی ترجمہ مرتب کر رہے تھے۔ حال میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے چوتھے اجتماع منعقدہ حیدرآباد ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کے موقع پر انھوں نے ایک مقالہ

Sultan Mohammad bin Tughlaq among The Jogis

کے عنوان سے پڑھا، مجھے اس فاضلانہ مقالہ کے سننے کا تو شرف حاصل نہیں ہوا، البتہ اس کا ملخص میرے سامنے ہے، اس میں فاضل مقالہ نگار نے اپنی کاوش و تحقیقات کا خلاصہ دیا ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

ا- "فتوح السلاطین" کے ابیات ۸۹۷۰-۹۰۵۶ [غالباً الٰہ آباد ایڈیشن کے ابیات ۹۶۳۷-۹۶۶۴] کی شرح ہے۔

ب- لفظ "جوگی" کی تعریف اور اسکے قدیم (قرون وسطیٰ کے) اور جدید مصادیق۔

ج- "جوگی" کی بنیادی تعریف کی سفرنامہ ابن بطوطہ سے تائید۔

د- ابن بطوطہ اور عصامی نے جو اپنی اپنی تصانیف میں محمد بن تغلق کی نفسیات و رجحانات کا تذکرہ کیا ہے، ان کا باہمی موازنہ۔

ہ- آخر میں انھوں نے اس سلسلے کے تمام مواد پر جن تک ان کی رسائی ہو سکی ہے محمد بن تغلق کے عہد کے سنسکرت کتبات کی روشنی میں نظرِ ثانی کی ہے۔ ان میں سے دو کتبوں کو بعینہٖ نقل کرنے کے بعد ان سے نتائج اخذ کیے ہیں

Marfat.com

"محمد بن تغلق کے عروج و زوال Rise and Fall of Mohammad bin Tughlaq) میں بھی انھوں نے دو سنسکرت کتبوں کا ترجمہ دیا ہے۔ معلوم نہیں انھیں دونوں کتبوں کو انھوں نے یہاں بھی دہرایا ہے یا ادھر کوئی نئے دو کتبے دریافت کیے ہیں۔ بہرحال پچھلے دو کتبوں میں سے پہلے کے جو ۳ ربھادرہ بدی سمبت ۱۳۸۴ وکرم (مطابق ۷ر اگست ۱۳۲۷ء) کا ہے، صرف پانچویں چھند میں محمود شاہی (محمد شاہ) کی مشرقی انداز میں مبالغہ آمیز تعریف ہے۔ اسی طرح دوسرے کتبہ کے جو غالباً سہ شنبہ ۵ ربھاگن شدی سمبت ۱۳۸۴ وکرم (مطابق ۸ر فروری ۱۳۲۸ء) کا مکتوبہ ہے۔ چھٹے چھند میں حکمران وقت کا نام "سری محمد ساہی" بتایا گیا ہے۔
اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے لفظ "جوگی" کی بڑی احتیاط سے تحقیق کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں بھگوت گیتا سے جو معلومات حاصل ہوسکیں، ان سے استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی تحقیقات کا ماحصل حسب ذیل ہے :-

(ا) گیتا کا "جوگ" اسلام کی "نماز" کی نظیر ہے۔

(ب) جس جوگ کو ضیاء الدین برنی نے محمد بن تغلق کے سلسلے میں بیان کیا ہے یا جو اس کی سیرت میں نمایاں نظر آتا ہے وہ گیتا میں مذکور جوگ کی مختلف قسموں میں سے "گیان جوگ" ہے۔[1]

(ج) سلطان محمد کے جین برہم سوری اور اس کے رفقا کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے۔

(د) بلکہ غالباً سلطان محمد سنسکرت جانتا تھا اور اس نے ہندو اور جین مت کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اور یقیناً ان میں ایسی دلکش باتیں بھی تھیں جنھوں نے سلطان کو

---

[1] "And Jog in the Gita being of different kinds that which he speaks Mohammad bin Tughlaq as depicted by Ziauddin Barani or that which finds illustration in the character of Mohammad bin Tughlaq is gyan jog."

Marfat.com

اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

(۷) یہ دلکش باتیں حسب تصریح فاضل محقق "گیتا" کے دھیائے ۶ چھند ۱۰، ۲۰ ہوں گی۔

(۸) آخر میں انھوں نے گیتا کے ادھیائے ۱۳ چھند ۲ کو آیت قرآنی "اللہ نور السموٰت والارض" کی اور ادھیائے ۱۰، ۵ چھند ۳۳ کو فاینما تولوا فثم وجہ اللہ کی نظیر بتایا ہے۔

ان میں سے پہلی اور آخری تحقیق تو غیر ضروری بحث و مناظرہ کے دروازے کو کھولتی ہے، جس کی تفصیل علمائے کرام کے ذمہ ہے یا پھر مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ماہرین خصوصی کا منصب ہے۔ تیسری اور چوتھی تحقیق پر مورخین روشنی ڈالیں گے، اور جب تک ان دعادی کا انقطاعی ثبوت بہم نہیں پہنچ جاتا، ان پانچویں تحقیق کی تعمیر ایک دلکش مفروضہ سے زیادہ قرار نہیں دی جا سکتی۔

البتہ دوسری تحقیق محل نظر ہے، اور یہ عاجز، فاضل مقالہ نگار کی علمی خدمات بالخصوص "فتوح السلاطین" کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی کاوش و تحقیق کا رہین منت ہونے کے باوجود ہنوز خود کو ان کی اس رائے گرامی کے ساتھ متفق بنانے میں قاصر رہا ہے کہ

جس جوگ کو ضیاء الدین برنی نے محمد بن تغلق کے سلسلے میں بیان کیا ہے اور جو اکبر کی سیر میں نمایاں نظر آتا ہے وہ گیان جوگ ہے۔"

میں فاضل مقالہ نگار کی اس رائے سے یقیناً متفق ہوں کہ

"سلطان محمد بن تغلق کی جوگیوں کے ساتھ مخالطت عبث اور بیکار نہیں تھی، نہ وہ ان کے کرتبوں سے دل بہلانے کے لیے تھی، نہ جیسا کہ عصامی کہتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ محض وقت برباد کرنے کے لیے یا اپنے اخلاق تباہ کرنے کے لیے میل جول رکھتا تھا۔"

لیکن جس جوگ کو وہ ان سے حاصل کرنے کا متمنی تھا، وہ "گیان جوگ" نہیں تھا، بلکہ "شکتی جوگ" تھا، جس کی اس کے جوش اقتدار کو علم و عرفان سے زیادہ ضرورت تھی۔

(معارف: فروری ۱۹۶۵ء)

Marfat.com

ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی

نام ونسب اور ابتدائی زندگی

ملک العلما کا نام احمد اور شہاب الدین لقب تھا مگر اس لقب کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس کے مقابلے میں اصل نام بالکل ہی بھلا دیا گیا۔ پدر بزرگوار کا نام شمس الدین اور جد امجد کا اسم گرامی عمر تھا، چنانچہ میر غلام علی آزاد نے "سبحۃ المرجان" میں لکھا ہے :

"مولانا قاضی شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی"[1]

قاضی شہاب الدین کا خاندان حسب تصریح فرشتہ غزنی سے آیا تھا (شہادت نیچے آ رہی ہے) مگر آزاد انھیں زاولی بتاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل وطن زابلستان تھا۔ دریائے ہلمند اور دریائے قندھار کے بالائی حصوں کے پہاڑی علاقہ کو عرب زابلستان کہتے تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس سے وہ علاقہ مراد لیا جاتا ہے جو غزنہ کے گرد واقع ہے۔[2]

(اس لیے فرشتہ اور میر غلام علی آزاد کی تصریحات میں کوئی منافات نہیں ہے)

ولادت کا سال بالتعیین معلوم نہیں لیکن غالباً آٹھویں صدی ہجری کے ربع آخر میں شہر دہلی کے اندر پیدا ہوئے۔ نشو و نما دولت آباد (دیوگری) میں پائی جو محمد تغلق کے عہد میں کچھ عرصے کے لیے دہلی کے بجائے اس کا دارالسلطنت رہ چکا تھا۔ اسی لیے دولت آبادی کہلاتے ہیں۔ فرشتہ ابراہیم شاہ شرقی کے حال میں لکھتا ہے :

"از جملہ فضلائے عصر او یکے قاضی شہاب الدین جونپوری ست اصل او از غزنین است در دولت آباد دکن نشو و نما یافت"[3]

---

[1] سبحۃ المرجان صفحہ ۳۰ [2] ملک قندھار کی سمت تقریباً جو دریائے ہلمند کے بالائی حصہ کے نزدیک واقع ہیں زابلستان کہلاتی ہیں۔ (جغرافیہ خلافت مشرقی صفحہ ۵۰۳) جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے دریائے ہلمند اور دریائے قندھار کے بالائی حصوں کے پہاڑی علاقہ کو عرب زابلستان کہتے تھے۔ اس لفظ کے معنی مبہم ہیں لیکن زابلستان سے بالخصوص وہ علاقہ مراد لیا جاتا ہے جو غزنہ کے گرد واقع تھا۔ اس کے مقابل کابلستان یعنی کابل کا ملک تھا جو زیادہ شمال میں بامیان کی سرحد پر واقع تھا۔ [3] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۹

Marfat.com

غالباً ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی ہوگی۔ بعد میں دہلی تشریف لے آئے۔

اعلیٰ تعلیم سلسلۂ تلمذ

ملک العلما نے اعلیٰ (مطولات کی) تعلیم دہلی میں آکر حاصل کی جہاں پہلے قاضی عبدالمقتدر شریحی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اپنی مستعدی اور سرعت فہم و ذکا کی بدولت بہت جلد استاد کی نظروں میں سما گئے۔ چنانچہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"قاضی عبدالمقتدر درباب او می فرمود: پیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم و مغز او علم و استخوان او علم است"[۱]

قاضی عبدالمقتدر شریحی نے ۷۹۱ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد ملک العلما مولانا خواجگی کی خدمت میں پہنچے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ مولانا خواجگی مولانا معین الدین عمرانی کے شاگرد رشید تھے۔ یہاں بھی بہت جلد ہم چشموں کے درمیان امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

مولانا القاضی شہاب الدین تلمذ علی القاضی عبدالمقتدر الدھلوی ومولانا خواجگی الدھلوی وھو من تلامذہ مولانا معین الدین العمرانی رحمہ اللہ تعالیٰ ففاق اقرانہ وسبق اخوانہ" (سبحۃ المرجان صفحہ ۳۹)

"مولانا قاضی شہاب الدین نے قاضی عبدالمقتدر دہلوی اور مولانا خواجگی دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور وہ (موخر الذکر) مولانا معین الدین عمرانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد تھے پس اپنے معاصرین میں فوقیت حاصل کی اور ساتھیوں سے بڑھ گئے"

ملک العلما نے مولانا خواجگی ہی سے سند حاصل کی۔

تیمور کا حملہ اور دہلی کا انخلا

اسی زمانہ میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا (۸۰۱ھ)۔ دہلی پر بھی اس کے حملے کی متوحش خبریں لگاتار سننے میں آنے لگیں۔ اسی زمانہ میں میر سید محمد گیسو دراز نے خواب دیکھا جس کی تعبیر مغلوں کا حملہ تھی[۱]۔ یوں بھی تیموری لٹیروں نے طلنبہ، ملتان اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تھا[۲]۔ اس کی تفصیلات سننے

---

[۱] مولانا خواجگی پیش از آمدن امیر تیمور گورگان بنابر رویا صالحہ کہ میر سید محمد گیسو دراز دیدہ بودند از آمدن مغل اخبار بودند از دہلی برآمدہ بجانب کالپی رسید متوطن شدہ، ہمان جا بسر برد۔ مقبرۂ ایشان بیرون شہر کالپی است" (اخبار الاخیار صفحہ ۱۴۴)

[۲] "در ماہ صفر سنہ احدی وثمانمائہ امیر تیمور صاحبقرانی قصبہ طلنبہ تاختہ و در ملتان نزول فرمودہ تمامی (باقی بر صفحہ)

کے بعد باشندگانِ دہلی کے لیے وطنِ مالوف میں قیام خودکشی کے مترادف تھا۔ لہٰذا دہلی کے اکثر و بیشتر وجوہ و اعیان ہجرت پر مجبور ہوئے۔ انھیں میں مولانا خواجگی بھی تھے۔ وہ بھی اپنے شاگردِ رشید قاضی شہاب الدین کو لے کر دہلی سے نکل پڑے اور کالپی پہنچے۔ کالپی اس زمانہ میں ایک بڑا اہم اور بارونق شہر تھا۔ بہرحال مولانا خواجگی تو وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ مگر قاضی شہاب الدین وہاں سے جونپور تشریف لے گئے جسے ابراہیم شاہ شرقی کی معارف پروری اور علم دوستی نے مشرق کا شیراز بنا دیا تھا۔ مولانا خواجگی کے دوست مولانا احمد تھانیسری دہلی ہی میں رہ گئے تھے: جہاں تیموری حملے کے دوران میں ان سے اور صاحبِ ہدایہ کے پوتے سے تیمور کے دربار میں جھگڑا ہوا۔ بعد میں مولانا بھی کالپی پہنچے اور وہیں وفات پائی۔

سلاطینِ جونپور کی علمی سرپرستی

مسلمانوں کی تاریخ میں علم و ادب کی سرپرستی لوازمِ جہانداری میں سمجھی جاتی رہی ہے۔ سلاطینِ جونپور نے بھی بڑی فراخ دلی سے اربابِ کمال کی تربیت میں حصہ لیا۔ ان میں ابراہیم شاہ شرقی کا نام خاص طور سے مشہور ہے اس کے بارے میں نظام الدین ہروی رقمطراز ہے:

"علما و بزرگان کہ از آشوبِ جہاں پریشان خاطر بودند، بجونپور کہ در آں ایام دارالامان بود، سر برآوردند، و آں دارالسلطنت از قدمِ علما، دارالعلم گردید و چندیں کتب و رسائل بنامِ او تصنیف شد مثل حاشیہ ہندی، بحر مواج، فتاویٰ ابراہیم شاہی و غیر ذلک"۔ (طبقاتِ اکبری ص ۲۸۵)

اسی طرح فرشتہ اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"ابراہیم شاہ بود متصف بعقل و دانش و تدبیر، در عصرِ وے فضلائے ممالک ہندوستان و دانشمندانِ ایران و توران کہ از آشوبِ جہان پریشان خاطر بودند، بدارالامان جونپور آمدہ در مہدِ امن و امان غنودند و از خوانِ احسانِ او ذلہا بر داشتہ بنام نامی او نانچہ بزبانِ علم خواہد آمد چندیں کتب و رسائل پرداختند"۔[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۷) اسیرانِ لشکر سارنگ خانی را کہ میرزا پیر محمد، زندہ داشتہ زیر تیغ بے دریغ گزرانید۔ و از آنجا توجہ فرمودہ سامانہ را گرفتہ و جہانے را کہ از گریختگان دیار دیپال پور و اجودھن و سرستی کہ از ترس بہر جانب سراسیمہ و سرگردان دست و پائے زدند، مقتول گردانید و جمعِ کثیر را معیّت ساختہ ہمراہ داشت و طے منازل و مراحل نمودہ از آب جون عبور کردہ میان دوآب آمدہ، و در میں مقام پنجاہ ہزار اسیر را تخمیناً کہ تاب تنگ بدست سپاہیان ناداہ بود، طعمہ تیغ ساخت و بعضے از اہلِ علما و اربابِ سعادتِ لشکر نیز کہ ہیچ گاہ با تیغ آشنائی نداشتند اسیر بہ اسیرانِ اہلِ اسلام ہندی ماہیند و خیال کردہ بطمعِ ثوابِ جہاد بدستِ خود بملکِ آخرت رسانیدند۔

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۰۵

Marfat.com

ان نوواردوں میں قاضی شہاب الدین، شیخ ابوالفتح (نبیرہ قاضی عبدالمقتدر شریحی) قاضی احمد بن محمد (مصنف فتاوائے ابراہیم شاہی) قاضی تاج الدین ظفرآبادی، مولانا قیام الدین ظفرآبادی، قاضی نصیرالدین (شاگرد قاضی عبدالمقتدر شریحی) شیخ خضر بن الحسن البلخی، قاضی نظام الدین غزنوی زیادہ مشہور ہیں۔

ابراہیم شاہ کو علما سے اس درجہ عقیدت تھی کہ وہ اُن پہ جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت کا خاص کارنامہ "فتاوائے ابراہیم شاہی" کی تدوین ہے۔

ابراہیم شاہ کا جانشین اس کا بیٹا محمود شاہ تھا۔ اس کی علم دوستی کے باب میں فرشتہ لکھتا ہے:۔

"سلطان محمود شاہ شرقی بجانب جونپور شتافت و بدستور پدر بزرگوار دست بذل و عطا از آستین جود و سخا برآوردہ علما و فضلا و جملی برایا جمیع طبقات انام را علی اختلاف مراتبہم و ظائف بہرہ مند گردانید" (تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۳۰۸)

اس خاندان کا آخری بادشاہ سلطان حسین شاہ شرقی تھا۔ وہ خود عالم تھا اور قاضی سماء الدین جونپوری کا شاگرد تھا جو ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلامذہ کے شاگرد تھے۔ حسین شاہ نے تخت نشین ہوکر انھیں قتلغ خاں کا خطاب دے کر اپنا وزیر بنالیا تھا۔

اس طرح شرقی سلاطین کی علمی سرپرستی اور علما جونپور کی علمی کاوشوں نے اس شہر کو "شیرازِ مشرق" بنا دیا تھا، چنانچہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"دار السرور جونپور کانت دار الخلافۃ للسلاطین الشرقیۃ نشأ بھا کثیر من المشائخ والعلماء" (سبحۃ المرجان ص ۳۹)

جونپور جو علما کا گھر ہے، شرقی سلاطین کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں کثیر التعداد علما و مشائخ پیدا ہوئے ہیں

ملک العلما جونپور میں

جونپور میں ملک العلما کی توقع سے زیادہ قدر ہوئی۔ سلطان ابراہیم شاہ نے انھیں ممالک محروسہ کا عہدۂ قضا تفویض کیا۔ اور اس کے ساتھ خطاب "ملک العلمائی" سے نوازا۔ منصب قضا کی جاہ و عزت تو اُن کی زندگی کے ساتھ ہی بھولی بسری داستان بن گئی مگر "ملک العلماء" کا خطاب آج بھی تاریخ کو یاد ہے اور قرون وسطیٰ کی تاریخ میں وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں،

"وذھب الی دار السرور جونفور، فاغتنمہ السلطان ابراھیم الشرقی جونفور وزدد ونصر سقاۃ السحائب الاحسان وزودہ وعظمہ بین الکبراء ولقبہ

بملک العلماء"[۱]

ملک العلما قاضی شہاب الدین جونپور پہنچے جو علما کا گھر ہے، پس سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اُن کے وعدِ مسعود کو غنیمت جانا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے ابرِ احسان سے اس سرزمین کو سیراب کیا۔ بادشاہ نے انھیں "ملک العلماء" کا خطاب دیا۔

عزت کا یہ عالم تھا کہ دربار میں چاندی کی کرسی پر انھیں بٹھایا جاتا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیاری کوشید و در روزہائے متبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست۔"[۲]

اس لیے جلد ہی محسود اقران ہو گئے۔

حریفوں سے مقابلہ

جاہ و ثروت ہمیشہ حساد پیدا کیا کرتے ہیں۔ ملک العلما بھی اس اجتماعیات کے کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ابراہیم شاہ شرقی کے یہاں جوان کی غیر معمولی قدر و منزلت ہوئی، اُس سے اُن کے ساتھیوں کو بڑا حسد ہوا اور وہ ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ ملک العلما نے یہ قصہ شفیق استاد (مولانا خواجگی) کو لکھا۔ انھوں نے ہمت بندھائی اور کچھ ہی دن میں حساد بدبین فنا ہو گئے۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

"قاضی جانب جونپور رفت سلطان ابراہیم شرقی اشرق اللہ ضریحہ مقدم او را مغتنم دانستہ لوازم قدر شناسی افزوں از وصف بجا آورد و بہ خطاب ملک العلمائی بلند آوازہ ساخت۔ عرق حسد ابنائے جنس در جنبش آمد۔ قاضی شکایت حساد بمولانا خواجگی نوشت۔ مولانا ایں دو بیت سعدی شیرازی در جواب قلمی فرمود۔

اے بیش از آنکہ در قلم آید ثنائے تو	واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو
اے بقائے عمر تو نفع جہانیاں	باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو

گویند در اندک زمانے جماعہ حساد فانی گشتند" (مآثر الکرام ص ۱۸۸، ۱۸۹)

یہ بچپن کے ساتھی جو آخر میں ملک العلما کے حاسد بن گئے تھے، مولانا احمد تھانیسری کے لڑکے تھے۔ مولانا احمد تھانیسری کا مولانا خواجگی کے ساتھ بڑا خلوص و محبت تھا۔ گو وہ (مولانا احمد تھانیسری) فترت تیموری کے زمانہ میں اپنے دوست کے ساتھ نہیں گئے، لیکن جب ان کی توقع کے خلاف تیمور نے اُن کی عزت نہ کی تو وہ بھی کالپی جانے

---

[۱] سبحۃ المرجان صفحہ ۳۹۔

[۲] تاریخ فرشتہ جلد ثانی صفحہ ۳۰۷۔

Marfat.com

پر مجبور ہو گئے، کالپی میں پھر اپنے قدیم دوست مولانا خواجگی کے ساتھ عقد مواخاۃ کی تجدید کی[۵۱]۔ مولانا احمد نے تو کالپی ہی میں وفات پائی، مگر اُن کی اولاد ابراہیم شاہ شرقی کی جود و سخا اور معارف نوازی کی داستانیں سن کر جونپور پہنچی اور وہاں ملک العلما کو جاہ و عزت کے اعلیٰ مدارج پہ فائز پایا۔ اس لیے برنا حسد اُن کی ایذا رسانی میں مشغول ہوئے۔ اسی کا شکوہ ملک العلما نے مولانا خواجگی سے کیا تھا، جس کے جواب میں انھوں نے مذکورہ بالا دو بیت لکھ کر بھیجے تھے۔

درس و تدریس اور علمی مشاغل

اس ذہنی انتشار و پراگندگی خاطر سے نجات ملی تو ملک العلما نے مسند درس و افادہ کو رونق بخشی بقول آزاد بلگرامی:

"فزین القاضی مسند الافادۃ دفاق البرجیس فی افاضۃ السعادۃ"۔

اس کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے تالیف و تصنیف کے ذریعہ افادات علمیہ قلم بند کیے۔

"والف کتبہا شارت بہا رکبان العرب والعجم"۔

اور یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ ملک العلما کی تصانیف جس قدر ہندوستان میں مقبول ہوئیں اُسی قدر بیرون ہندوستان میں بھی حتیٰ کہ مشاہیر افاضل عجم نے بھی ان کے ساتھ اعتنا کیا۔ اس کی تفصیل "تصانیف" کے ضمن میں آرہی ہے۔

ظاہر ہے ایسے باکمال کے ساتھ اگر سلطان ابراہیم شاہ کو عقیدت تھی تو بے جا نہ تھا یوں بھی وہ علما و فضلا کا عقیدت مند تھا اور ملک العلما کا تو خاص طور سے۔ اگر ان کے پھانس بھی چبھ جاتی تو بے چین ہوجاتا، اور ان کی تکلیف کو خود لینے کی دعا کرتا۔ فرشتہ کہتا ہے:

"گویند وقتے مولانا شہاب الدین (ملک العلما) را مرضے طاری شد۔ سلطان ابراہیم بعیادت او رفتہ۔ بعد از تفتیش احوال و اظہار لوازم مہربانی قدحے را پُر آب کردہ گرد سر مولانا گردانید و خود نوشیدہ گفت۔ بارخدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد

---

[۵۱] مولانا احمد تھانیسری از آنجا بابل خیال برآمدہ بکالپی متوطن شد و طریقہ مواخاۃ کہ مولانا خواجگی بود و سلوک می داشتند۔ میان اولاد ایشاں و قاضی شہاب الدین کہ شاگرد و فرزند معنوی مولانا خواجگی بود، نقاہ واقع شد۔ قاضی شکوہ ایشاں با بخدمت مولانا خواجگی نوشتہ استعانت نمود۔ مولانا این دو بیت شیخ سعدی را در جواب او نوشت"۔

[۵۲] سبحۃ المرجان صفحہ ۳۹

تعصیب من گرداں وادراشفا بخش - وازیں جا عقیدۂ آں صاحب تاج وتخت نسبت بعلمائے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مے تواں کردکہ تاچہ غایت بود۔" (تاریخ فرشتہ جلد ثانی ص ۳۰۶)

وفات

قاضی شہاب الدین کو بھی سلطان ابراہیم سے بے حد محبت تھی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ جب ۸۴۰ھ میں سلطان کا انتقال ہوا تو ملک العلما کو اس سے انتہائی صدمہ ہوا اور اسی غم میں داعی اجل کو لبیک کہا

"قاضی شہاب الدین نیز باسلطان عصر موافقت کرد چنداں از فوت شاہ ابراہیم شاہ مغموم گشت کہ در ہماں سال یعنی اربعین وثمان مائۃ بعالم قدس تشریف برد۔ والبقاء للملک المحمود۔" (تاریخ فرشتہ ج ثانی ص ۳۰۶)

دوسری روایت ہے کہ قاضی شہاب الدین نے ۸۴۲ھ میں وفات پائی چنانچہ فرشتہ آگے چل کر لکھتا ہے "وبعضے گویند بدو سال بعد از فوت سلطان ابراہیم طائر روحش در سنہ اثنی واربعین وثمان مائۃ بروضہ رضوان پرواز کرد۔"

صاحب "اخبار الاخیار" ان کا سال وفات ۸۴۸ھ بتاتے ہیں[1] لیکن آزاد بلگرامی نے اُن کی وفات ۲۵ رجب المرجب ۸۴۹ھ بتائی ہے:

"توفی لخمس بقین من رجب المرجب سنۃ تسع واربعین وثمانمائۃ ودفن بجونفور فی الجانب الجنوبی من مسجد السلطان ابراہیم الشرقی۔"[2]

اسی طرح "مآثر الکرام" میں لکھا ہے:

"قاضی در بست وپنجم رجب المرجب ۸۴۹ھ تسع واربعین وثمانمائۃ بہ گلگشت فردوس اعلیٰ شتافت۔ مرقد منورش در بلدۂ جونپور جانب جنوبی مسجد سلطان ابراہیم شرقی۔" (مآثر الکرام ص ۱۸۹)

معاصرین

قاضی شہاب الدین کے تلامذہ کے علاوہ جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، دیگر فضلائے روزگار نے بھی جونپور کی ثقافتی ثروت میں حصہ لیا۔ ان کا استقصار تو بہت مشکل ہے، صرف اُن مشاہیر علم وفضل کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے نام عام تاریخ وتراجم کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں:

---

[1] "وفاتِ او در سنہ ثمان واربعین وثمان مائۃ. قبر او در شہر جونپور است۔" (اخبار الاخیار ص ۱۸۰)

[2] سبحۃ المرجان، ص ۳۹

Marfat.com

ان میں سب سے مشہور قاضی عبدالمقتدر شریحی (استاد ملک العلما شہاب الدین) کے پوتے اور شاگرد مولانا ابوالفتح بن عبدالحی تھے۔ وہ ۷۷۲ھ میں اپنے والد کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پیدا ہوئے، لہٰذا دادا قاضی عبدالمقتدر نے پرورش کی اور انھیں سے تعلیم حاصل کی۔ بعد فراغت کچھ دن دہلی میں درس وتدریس کے فرائض دیتے رہے۔ فترت تیموری کے زمانہ میں دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور جونپور پہنچ کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ فقہ واصول علم کلام اور عربی ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ۸۵۸ھ میں وفات پائی۔ مولانا ابوالفتح کے ملک العلما کے ساتھ اصول کلامیہ اور فروع فقہیہ میں مباحثے بھی ہوا کرتے تھے۔[۱]

اس عہد کے علما میں دوسرا مشہور نام قاضی نظام الدین احمد بن محمود جونپوری صاحب فتاوائے ابراہیم شاہیہ" کا ہے۔ ان کے اسلاف عرب سے آئے تھے اور گجرات میں متوطن ہو گئے تھے۔ قاضی نظام الدین احمد کی ولادت وہیں ہوئی۔ اور وہیں کے علما سے انھوں نے تعلیم حاصل کی اور فقہ واصول میں خاص طور سے تبحر حاصل کیا، یہاں تک کہ اکابر علما میں محسوب ہونے لگے، مگر بعد ازاں جونپور چلے آئے جہاں ابراہیم شاہ شرقی نے انھیں عہدہ قضا عنایت کیا۔ قاضی نظام الدین احمد کا بڑا کارنامہ جسے شرقی سلاطین کی علمی سرپرستیوں کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔ "فتاوائے ابراہیم شاہیہ" کی تدوین ہے۔ اسی زمانہ میں قاضی حماد الدین گجراتی کے ایما سے "فتاوائے حمادیہ" مدون ہوا تھا، مگر شہرت "فتاوائے ابراہیم شاہیہ" ہی کو ہوئی۔ فقہ حنفی کا یہ شاہکار ایک سو ساٹھ فقہ کی کتابوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ حاجی خلیفہ نے اسے "فتاوائے قاضی خاں" کا ثانی بتایا ہے۔ قاضی نظام الدین احمد نے ۸۷۴ھ میں وفات پائی۔

اس کے بعد ایک اور مشہور عالم قاضی نصیر الدین گنبذی تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی زندگی بسر کی۔ اور قاضی عبدالمقتدر شریحی سے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ فاتحہ فراغ کے بعد دہلی ہی میں درس وتدریس کا سلسلہ

---

[۱] "شیخ ابوالفتح جونپوری مرید وشاگرد جد خود است قاضی عبدالمقتدر را ونیز بر طریقہ جد خود فاضل ودانشمند بود وبر کرم صحبت او بود، درس وافادہ علوم مشغول فصیح بود ودر زبان عربی قصائد ودر زبان فارسی نیز شعرے دارد۔ او را با قاضی شہاب الدین در اصول کلامیہ وفروع فقہیہ مباحثے بود خصوصاً در زبادکہ از گربہ شکیں می چکد۔ شیخ آں را نجس می گفت وقاضی بطہارت او می رفت واز آنچہ شیخ در بعضے رسائل کہ دریں بحث تالیف کردہ ونوشتہ است واولاد او بعضے سخناں از وے دریں بحث نقل می کنند معلوم می شود کہ بر شیخ طریقہ موالی از طعن وتشنیع خصم غالب بود ومحتمل کہ آں ہا ہم در ایام بحث بسبب بعضے عوارض عارض شدہ باشد۔" (اخبار الاخیار ص ۱۰۵)، شیخ ابوالفتح بن عبدالحی کے شاگردوں میں شیخ محمد بن ابی انبعاگہ ثانی لکھنوی اور شیخ محمد بن ابی محمد قدوائی دریابادی خاص طور سے مشہور تھے۔

Marfat.com

شروع کیا مگر فترت تیموری کے زمانہ میں دہلی چھوڑ کر جونپور چلے آئے۔ جہاں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ آخر عمر میں مستعفی ہو کر عزلت گزیں ہو گئے اور بقیہ عمر زہد وعبادت میں گذار دی۔ قاضی شہاب الدین نے جب "ارشاد" کو تصنیف کیا تو اُن سے خواہش کی کہ اسے اپنے یہاں نصاب میں داخل کر لیں، تاکہ اُن کی قدر افزائی سے کتاب کو قبول عام نصیب ہو جائے۔ قاضی نصیر الدین نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی مگر کہا اسے نصاب میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[۱]

ابراہیم شاہ کی علم دوستی وعلما نوازی نے جن مشاہیر اہل کمال کو بیرون ہند سے کھینچ بلایا، اُن میں قاضی نظام الدین غزنوی اور ان کے صاحبزادے قاضی منار الدین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ قاضی نظام الدین ۸۱۰ھ میں اپنے والد اور استاد قاضی صدر الدین حسین کی وفات پر اپنے بیٹے کے ہمراہ جونپور آئے۔ یہاں ملک العلماء کی سفارش سے ابراہیم شاہ شرقی نے انھیں مچھلی شہر کا قاضی مقرر کیا تھا۔

جونپور ہی کے نواح میں ظفر آباد ہے۔ یہ قصبہ بھی اس زمانہ میں اہل علم کا مرکز تھا۔ مشاہیر علما میں قاضی تاج الدین، شیخ رکن الدین، مولانا قیام الدین اور مولانا نور الدین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

علمائے کرام کے علاوہ اس عہد میں جونپور کو اکثر مشائخ عظام کے نفوس قدسیہ کی خیر و برکت بھی نصیب تھی جیسے شیخ اسد الدین حسینی الواسطی، ان کے صاحبزادے شیخ نور الدین اور شیخ نور الدین کے صاحبزادے شیخ قطب الدین ظفر آبادی جو ملک العلما کے شاگرد تھے۔ دیگر مشائخ عظام میں شیخ امجد بن اجمل جونپوری، شیخ جلال الدین جونپوری، شیخ رکن الدین جونپوری اور مولانا عادل ملک جونپوری مشہور ہیں۔

مشائخ جونپور کے گل سرسبد حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولوی رحمہ اللہ تعالیٰ تھے جن کا مزار ردولی شریف میں ہے۔ انھیں کی روحانیت سے شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ نے جو ملک العلما کی دختری اولاد میں بڑا بلند مقام رکھتے ہیں، فیض حاصل کیا تھا۔ شیخ احمد عبد الحق کا وصال ۸۳۶ھ میں ہوا لیکن جن مشائخ سے ملک العلما کے خصوصی تعلقات منقول ہیں وہ تھے: شاہ بدیع الدین مدار رحمہ اللہ اور امیر سید اشرف جہانگیر سمنانی۔ شاہ بدیع الدین مدار [illegible]

---

[۱] قاضی نصیر الدین گنبذی: دانشمند بود و درویش، ہیچ چیز از دنیا نداشت۔ نقل است کہ وقتے کہ قاضی شہاب الدین حواشی کافیہ ساخت بخدمت او فرستاد والتماس نمود کہ اگر ایشان این حواشی را درس گویند، قبول دیگر یابد، او بجہت غلبۂ اشتغال باطن و یا برائے سد باب بحث و نزاع نظر اجمالی بران انداخت و گفت خوب نوشتہ اند۔ احتیاج درس گفتن نیست۔

(اخبار الاخیار صفحہ ۱۸۱)

Marfat.com

کے اجل شیوخ میں سے تھے۔ صاحب "اخبار الاخیار" لکھتے ہیں :-

"غریب احوال و عجائب اطوار از وے نقل می کنند۔ گویند کہ وے در مقام صمدیت کہ از مقامات سالکان است بود تا دوازدہ سال طعام نخوردہ و لباسے کہ یکبار پوشیدہ، بار دیگر احتیاج بتجدید غسل او نشدے۔ اکثر احوال برقع بروکشیدہ بودے۔ گویند ہر کرا نظر بر جمال او افتادے بے اختیار سجدہ کردے۔ سلسلۂ او بسبب کبر سن یا جہتے دیگر بہ پنج و شش واسطہ بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم مے پیوند۔" (اخبار الاخیار ص ۱۶۴)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے یہ تو لکھا ہے کہ شاہ مدارؒ نے ملک العلما کو کوئی مکتوب لکھا تھا[۱] جس کا مضمون اُن کے زمانہ میں معروف و مشہور ہوگا لیکن آج کل اس کی تصریح نہیں ملتی۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ غالباً ملک العلماء نے شاہ مدارؒ کے مریدوں کی غیر شرعی رسموں پر نکیر و گرفت کی ہوگی[۲]، بالخصوص اُن کے "سجدہ" پر[۳]۔ اسی کی مدافعت میں شاہ مدارؒ نے ملک العلماء کو مکتوب لکھا ہوگا۔

دوسرے جلیل القدر بزرگ امیر سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمہ اللہ تعالیٰ تھے۔ وطن مالوف سے امیر سید علی ہمدانی رہ کے ساتھ سیر و سیاحت کے لیے نکلے اور ہندوستان چلے آئے جہاں شیخ علاء الحقؒ کے مرید ہوئے۔ اگرچہ علوم طریقت و معرفت میں انھیں اس سے پہلے ہی تبحر حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے مکاتیب و ملفوظات حقیقت و تصوف میں بڑا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ملک العلما کے معاصر تھے[۴] اور انھوں نے ان سے "ایمانِ فرعون" کے مسئلہ کی جو فصوص الحکم ابن عربی کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے[۵]، تحقیق چاہی تھی۔ جس کے جواب میں امیر سید اشرف جہانگیر

---

[۱] "قاضی شہاب الدین دولت آبادی در عہد او بود۔ مکتوبے در مردم ہست کہ گویند شاہ مدار بجانب قاضی شہاب الدین نوشتہ بود۔" (اخبار الاخیار ص ...)

[۲] جس طرح ملک العلما نے شیخ رکن الدین اور ان کے مریدوں پر احتساب کیا تھا۔ شیخ رکن الدین شریعت کا زیادہ احترام نہیں کرتے تھے۔ اُن کے مرید اُن کے آگے سجدہ کیا کرتے تھے اور وہ انھیں منع نہیں کیا کرتے تھے۔ ملک العلما نے ان کے اس فعل پر باقاعدہ گرفت کی تھی۔ [۳] شاہ مدارؒ کے لیے تو شیخ عبدالحق محدثؒ کی تصریح اوپر مذکور ہو چکی ہے کہ جو انھیں دیکھتا بے اختیار سجدے میں گر جاتا۔ [۴] "میر سید اشرف سمنانی با قاضی شہاب الدین دولت آبادی معاصر بود، غالباً قاضی از وے تحقیق بحث ایمانِ فرعون کہ در فصوص اشارتے بداں واقع شدہ است کردہ بود۔ ودریں باب بوے مکتوبے نوشت۔" (اخبار الاخیار ص ۱۶۶)

[۵] "بباید دانست کہ در فصوص کہ از نسبت او سخن افتادہ دو جا آوردہ اند کہ بدلائل عشرہ استشہاد اند۔ مشکل ترین مقامات و مغلق ترین مقدمات وے آنست کہ بسیار شارحاں دریں جا بیچیدہ اند و سخن با اصل مبحث نرسانیدہ اند۔" (مکتوب امیر سید اشرف جہانگیر بنام قاضی شہاب الدین بحوالہ اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۶)

Marfat.com

نے ایک مبسوط خط لکھا تھا[1] اس خط میں انھوں نے اپنے ایک مرید شیخ رضی کی سفارش بھی کی تھی۔[2]

جلالت قدر

قسامِ ازل نے عزت و احترام کی نعمت ملک العلما کو شروع ہی سے دی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں اُن کے استاد عبدالمقتدرؒ فرمایا کرتے تھے :

"پیشِ من طالب علمے می آید کہ پوست او علم و مغز او علم و استخوان او علم است۔"

شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ

"از یں طالب علم قاضی شہاب الدین را علیہ الرحمۃ می خواست۔" (اخبارالاخیار۔ صفحہ ۱۵۱)

دوسرے استاد مولانا خواجگی نے ان کی تعریف میں لکھ کر بھیجا تھا :

اے بیش ز آنکہ در قلم آید ثنائے تو — واجب بر اہل مشرق و مغرب دعائے تو

اے در بقائے عمر تو نفع جہانیاں — باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو

امیر سید اشرف جہانگیر جن کا مشائخ وقت میں بڑا رتبہ تھا اور جو غالباً ملک العلما سے عمر میں بھی بہت زیادہ بڑے تھے انھیں "برادر اعزا ارشد جامع العلوم" کہہ کر خط لکھا کرتے تھے۔ مکتوب محولہ میں اُن کی علمیت

---

[1] اس خط کو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے۔ آغاز بدیں طور ہے :

"برادر اعزا ارشد جامع العلوم قاضی شہاب الدین نور اللہ تعالیٰ قلبہ بانوار الیقین دعا درویشانہ و ثنا بر کیشانہ از درویش اشرف قبول فرمایند۔ نامہ مندرج بہ بعضے از سخنان بود رسید۔ و استفسارے کہ از مبحث فصوص الحکم بہ نسبت فرعون تقاضا کردہ اند بوصول انجامید۔" (اخبار الاخیار، ص ۱۶۶)

اس مکتوب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک العلما صوفی مشرب تھے چنانچہ مسئلہ ایمان فرعون کی وضاحت کے بعد لکھا ہے :

"ہر چند آں برادر قدوۂ علمائے روزگار و زبدۂ فضلا ہر دیار است اما بعنایت الٰہی و حمایت نامتناہی و از التفات ایں طائفہ علیہ و توجہات ایں زمرۂ سنیہ شربے از مشرب صوفیہ و طربے از مشرب باطنیہ دارند و ایں را از اعلیٰ ترین منزلت و حری ترین نعمت تصور کنند۔ بہ بعضے از اذکار معمول مشائخ چشت گفتہ آمدیم معمول دارند آنچہ از آثار نمے نمودار شود بنویسند تا مطابق او بہ نمودار رہمان یا لموار شیطان اقبال و اہمال گفتہ آید۔" (مکتوب اشرفی بحوالہ اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۷)

[2] جناب نتیجۃ المشائخ شیخ رضی کہ مصحوب نامہ تشریف بردہ اند غالباً بعضے او مایحتاج خود بسلطان ابراہیم مضاعف اقتدارہ عرضہ خواہند کرد۔ توقع از مکارم اخلاق برادرانہ آنکہ سعی و رعایت دریغ نخواہد فرمود۔" (ایضاً، ص ۱۶۷)

Marfat.com

کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آں برادرِ تدرو علمائے روزگار زبدۂ فضلائے بردیار است"

سلاطین وقت کے یہاں اُن کی جو عزت تھی اس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ نہ صرف انھیں ظاہری عزت سے نوازتا تھا بلکہ قلبی خلوص بھی رکھتا تھا کہ اگر اُن کے پھانس چبھ جاتی تو بے چین ہو جاتا اور اُن کی تکلیف کو خود لینے پر آمادہ ہو جاتا۔

دربار سلطانی میں ملک العلما کے اس عزت و احترام سے دور و نزدیک کی رعایا بھی واقف تھی اور لوگ انجاح مقاصد کے لیے اُن کی سعی و سفارش کے وسائل ڈھونڈا کرتے تھے۔ امیر سید اشرف سمنانیؒ نے اپنے عقیدتمند شیخ رضی کی سفارش کے طور پر آپ کو خط لکھا جس میں مسئلہ ایمان فرعون کے اغلاق و اشکال کے حل و توضیح کو اس سفارش کے لیے بطور توطیہ مقصد استعمال کیا اور آخر میں تو تصریح بھی کر دی:

"از انجا کہ درویشاں اطراف روزگار و دل ریشاں اکناف دیار فہمیدہ اند کہ نسبت بفقیر جناب ایشاں را سرے صحبتے است، ضرورت می گردد کہ گاہ گاہ تصدیع اوقات شریفہ مادہ می آید۔ معذور خواہند داشت۔" (مکتوب اشرفی بحوالہ اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۹)

بعد کے لوگوں میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شہرت او مستغنی است از شرح آں۔ اگرچہ درزماں او دانشمنداں بودہ اند کہ استاداں و شریکاں او بودہ اما شہرت و قبولے کہ حق تعالیٰ او را عطا کرد ہیچ کس را از اہل زماں او نکرد۔" (اخبار الاخیار صفحہ ۱۸۰)

متاخرین میں میر غلام علی آزاد نے اُن کے بارے میں لکھا ہے:

"چراغ امتیاز در انجمن اقران برافروخت۔ اگرچہ درآں عہد دانش منداں دیگر نیز فائق عصر بودند، اما طالع شہرتے کہ او یافت احدے را میسر نگشت۔ و آثارے کہ از و بر صحیفہ روزگار باقی ماند از دیگرے پیدا نیست۔" (مآثر الکرام ص ۱۸۹)

اسی طرح وہ (میر غلام علی آزاد) "سبحۃ المرجان" میں لکھتے ہیں:

"فاق اقرانہ و سبق اخوانہ"[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"زین القاضی مسند الافادۃ ورّاق البرجیس فی افاضۃ السعادۃ والف کتباً سارت

---

[1] سبحۃ المرجان صفحہ ۳۹

بھارکیان العرب والعجم وازکی سراجا الھدی من النار الموقدہ علی العلم[1]

عہدِ حاضر میں مولانا عبدالحیؒ "نزہتہ الخواطر" میں لکھتے ہیں :-

"کان غایۃ فی الذکاء و میلان الذھن وسرعۃ الادراك وقوۃ الحفظ و شدۃ الانہماک فی المطالعۃ والنظر فی الکتب لانکاد نفسہ تشبع من العلم، ولا تروی من المطالعۃ ولا تمل من الاشتغال ولا تکل من البحث" (نزہتہ الخواطر: الجزالثالث ص ۱۹)

"ملک العلماء ذہانت و ذکاوت، سرعت انتقال ذہنی، تیزی فہم و ادراک، قوتِ حفظ اور مطالعہ میں شدت انہماک نیز وسعت نظر میں انتہائی درجہ کو پہنچے ہوئے تھے کہ حصولِ علم سے سیری ہی نہیں ہوتی تھی، نہ مطالعہ کی پیاس بجھتی تھی، نہ شغل علمی سے تکان محسوس کرتے تھے اور نہ بحث سے تھکتے تھے"

اولاد امجاد

قاضی شہاب الدین کی کسی اولاد نرینہ کا پتہ نہیں چلتا۔ دختر نیک اختر کی شادی شیخ نصیر الدین نظام الدین کے ساتھ ہوئی تھی۔ شیخ نظام الدین امام ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے، پہلے دہلی آئے، پھر جونپور تشریف لائے۔

ملک العلما کی صاحبزادی سے شیخ نصیر الدین بن نظام کے یہاں تین لڑکے پیدا ہوئے: صفی الدین - رضی الدین اور فخر الدین۔

شیخ صفی الدین (المتوفی ۸۱۹ھ) غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے کی اور علوم باطنی کی امیر سید اشرف جہانگیرؒ سے۔ شیخ صفی الدین کے بارے میں امیر سید اشرف جہانگیر فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں جامعیت و تبحر علمی کے اندر شیخ صفی جیسا نادرہ زمان ہم نے نہیں دیکھا۔ ورع و تقویٰ کے ساتھ دستگاہ علمی بھی رکھتے تھے۔ تصانیف میں دو کتابیں مشہور ہیں جنھیں اپنے صاحبزادے شیخ اسماعیل کے لیے تصنیف کیا تھا: دستور المبتدی صرف میں اور غایۃ التحقیق نحو میں۔ "غایۃ التحقیق" کافیہ کی شرح ہے اور ہندوستانی عبقریت کے ان کارناموں میں سے ہے جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے بھی "کشف الظنون" میں کیا ہے، چنانچہ وہ شرح کافیہ کی تفصیل میں لکھتے ہیں:

---

[1] سبحۃ المرجان صفحہ ۱۹

Marfat.com

"ومنها غاية التحقيق لصفی بن نصیر وھو شرح ممزوج اولہ الحمد للہ الذی انعم علینا بنعمہ العظام الخ. وھو من تلامذۃ الھندی ذکرہ فیہ و مدح حاشیۃ وقال ان شروح الکافیہ لیست بوانیۃ الاحواشی استاذنا شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی"۔

"شرح کافیہ میں سے "غایۃ التحقیق" ہے جو شیخ صفی الدین بن نصیر الدین کی تصنیف ہے اس کی ابتدا 'الحمد للہ الذی انعم علینا بنعمۃ العظام' سے ہوتی ہے۔ شیخ صفی علامہ ہندی (ملک العلما قاضی شہاب الدین) کے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کافیہ کی شرحیں حل مطالب میں غیر کافی ہیں سوائے ہمارے استاد شہاب الدین احمد بن عمر الدولت آبادی کے حواشی کے۔

حاجی خلیفہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کافیہ فہمی کے لیے اکثر لوگ اسی کتاب پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ مصنف نے اسے بڑی تحقیق سے لکھا ہے:

"وکثیر من الناس اکتفوا بما فھموہ من ظاہرھا فانہ حقق فیہا وسماھا غایۃ التحقیق"

اور بہت لوگ جو کچھ اس کے ظاہر سے سمجھتے ہیں اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں کیونکہ مصنف نے اس میں داد تحقیق دی ہے اور (بجا طور پر) اس کا نام "غایۃ التحقیق" رکھا ہے۔

شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل اذکیائے روزگار میں سے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں منقول و معقول سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد مسند درس پر بیٹھے۔ اپنے پدر بزرگوار کی وفات پر اُن کے سجادہ نشین ہوئے: ۸۶۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ صفی الدین کے پوتے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بڑے متبع سنت اور جید عالم تھے علم کلام کی متداول کتاب "شرح الصحائف" پر تعلیقات لکھیں۔ نیز "عوارف المعارف" اور "التعرف" کی شرح لکھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب "انوار العیون فی اسرار المکنون" بھی اُن سے یادگار ہے۔ بیعت شیخ احمد عبدالحق کے پوتے شیخ محمد بن عارف سے کی تھی مگر فیض احمد عبدالحقؒ کی روحانیت سے حاصل کیا تھا۔ ۹۴۵ھ میں وفات پائی۔ صاحب اخبار الاخیار لکھتے ہیں:۔

"شیخ عبدالقدوس۔ صاحب علم و عمل و ذوق و حالت و حلاوت و وجد و سماع۔ اگرچہ بظاہر دست بیعت از شیخ محمد گرفتہ است ولے معتقد و عاشق شیخ احمد عبدالحق است و بروحانیت او شغوف"۔ (اخبار الاخیار صفحہ ۲۲۱)

شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد میں اللہ تعالٰی نے بہت زیادہ برکت دی اور سبھی علم و عمل اور زہد و عبادت سے متصف

Marfat.com

تھے۔ شیخ عبدالحق فرماتے ہیں :-

"شیخ عبدالقدوس را اولاد بسیار شد و پسران او ہمہ عالم و متعبد و متلبس بلباس مشائخ۔ واز میان ایشان شیخ رکن الدین مردے متبرک بود و بمشرب فقر و محبت موصوف بر قدم والا خود قدم می نہاد" (ایضاً صفحہ ۲۲۲)

شیخ عبدالقدوس اور ان کے لڑکے وحدت الوجود کے بڑے سرگرم مبلغ تھے لیکن پوتے شیخ عبدالنبی اس کے منکر تھے۔ اسی لیے اُن کے والد نے ناراض ہو کر انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ والد شیخ رکن الدین نے غنا و سماع کی حلت میں ایک رسالہ لکھا تھا مگر صاحبزادے نے حرمت ثابت کی۔[۱]

ملک العلما کے خاندان میں اُن کے بعد دنیوی وجاہت کسی کو اتنی نصیب نہیں ہوئی جتنی شیخ عبدالنبی کو حاصل ہوئی تھی۔ وہ حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے جہاں حدیث کی تکمیل کی۔ ۹۷۱ھ میں اکبر نے صدر الصدور بنایا۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں :

"بادشاہ وقت دراں زماں صدرے می خواست کہ بصفت علم و دیانت موصوف باشد۔ بتوسط بعضے اسباب و وسائل در ۹۷۱ھ احدی و سبعین و تسع مائۃ بر مسند صدارت نشست۔ زیادہ از انچہ استحقاق داشت منصب عزت و صدارت یافت و دریں امر کوس استقلال و استبداد زد۔ و از مال و جاہ اعتبار زیادہ از انچہ گفتہ شود نصیب او شد۔ (اخبار الاخیار صفحہ ۲۲۲)

اس منصب میں جو غیر معمولی وجاہت انھیں نصیب ہوئی اس کے بارے میں بدایونی نے لکھا ہے :

"و دریں سال یا سال گذشتہ بتحقیق نزدیک است، شیخ عبدالنبی محدث نبیرہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی را کہ از کبار

---

[۱] یکے از ابنائے او شیخ عبدالنبی بود کہ تحصیل بعضے علوم رسمیہ نمودہ بود۔ در جوانی متوجہ زیارت حرمین شدہ پیش بعضے از فقہائے مکہ معظمہ برشے از حدیث نبوی برخواند۔ بعد ازاں بوطن اصلی عود کرد۔ و بر تزہد و تعشق منسوب با پدر و اعمام بجہت مسئلہ توحید و سماع در افتاد۔ بعد او در باب اباحت سماع رسالہ نوشت و او نیز در باب آں رسالہ در انکار سماع ساخت۔ لاجرم باعث ایذا و کلفت بسیار شد وایں باعث شہرت او گشت" (اخبار الاخیار صفحہ ۲۲۲)

اسی طرح بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے :

شیخ عبدالنبی صدر الصدور ولد شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی است. چند مرتبہ در مکہ معظمہ و مدینہ منورہ رفتہ علم حدیث را خواندہ۔ بعد ازانکہ بازگشتہ آمد از روش آبا و اجداد کرام سماع و غنا را منکر بود و بروش محدثین سلوک مے نمود" (منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۷۹)

مشائخ ہند بست، ز قصبۂ اندی کرنال طلبیدہ، صدر الصدور ساختند تا باتفاق مظفر خاں مدد معاش بدہد بعد ازاں مستقل چناں شد کہ عالم عالم اوقاف و انعامات و ادرارات بمستحقاں بخشید، چنانچہ اگر بخشش جمیع بادشاہان سابق ہند را در یک پلہ نہند، انعام ایں عہد را در پلۂ دیگر ہنوز ایں راجح آید۔" (منتخب التواریخ نولکشوری صفحہ ۱۵۴-۱۵۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"چوں بمنصب صدارت رسید، جہاں جہاں زمین مدد معاش و وظائف و اوقاف بخلائق بخشید چنانچہ در زمان ہیچ پادشاہے ایں چنیں صدرے باستقلال نہ گزشتہ و عشر عشیر ایں اوقاف کرادہ و نداد۔" (ایضاً ص ۲۰۵)

بادشاہ کی نظر میں یہ وقار پیدا کیا بقول بدایونی:

"بادشاہ را چندگاہ نسبت باو آنچناں اعتقاد پیدا شدہ بود کہ کفش پیش پائے او می نہادند۔" (ایضاً ص ۲۰۵)

لیکن بعد میں پہلے مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کی مخالفت سے اور آخر میں بادشاہی حرم کی ناراضگی کے نتیجے میں معزول کیے گئے۔ بدایونی نے لکھا ہے:

"آخر بجہت مخالفت مخدوم الملک و سائر علمائے بدنفس حیلہ گر۔ آں نسبت معکوس شد۔"

شیخ عبدالنبی کے زوال میں سب سے زیادہ ہاتھ اکبر کی ہندو رانیوں کا تھا۔ ایک برہمن نے شان رسالت میں گستاخی کی۔ جُرم اس پر ثابت ہوگیا۔ شیخ عبدالنبی نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت مانگی، مگر اس نے ہندو بیگمات کی خوشنودی کے لیے اس میں آنا کانی کی۔ آخر شیخ نے اسے قتل کرادیا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے مزید یہ کہ ہندو بیگمات اور مقربین نے اور مزاج برگشتہ کر دیا۔ بقول بدایونی:

"چوں ایں معنی بعرض رسانیدند خیلے درہم و برہم شدند و اہل حرم از دروں و سائر مقرباں ہند و از بروں گفتند کہ ایں ملایاں را شما نوازش فرمودید و کار ایشاں حالا بجائے رسیدہ کہ ملاحظہ خاطر شما ہم نمی کنند۔" (ایضاً ص ۲۰۶)

اتنے میں شیخ مبارک اور ابوالفضل کو بار مل گیا اور انھوں نے بادشاہ کو مجتہد مطلق بننے کا مشورہ دیا۔ علماء دربار نے فتویٰ دیا اور مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی سے بھی بجبر و اکراہ اس محضر پر دستخط کرائے گئے۔ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے:

"شیخ عبدالنبی و مخدوم الملک را چوں احاد الناس در آن مجلس پاجیاں بزور گرفتہ آوردند، ہیچ کس تعظیم ایشاں نکرد و در صف نعال نشستند۔"[۱]

---

[۱] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۸۳

Marfat.com

بہرحال حسب تصریح شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۹۸۶ھ میں بڑی بے آبروئی کے ساتھ معزول کیے گئے:

"بعد از مرور سنین و مشہور مزاج سلطنت بسبب بعضے حوادث بادے منحرف شد و از منصب صدارت معزول گشت وکان ذلک فی سنہ ست وثمانین وتسع مائۃ" (اخبار الاخیار، صفحہ ۲۲۲)

اس کے بعد انھیں اور مخدوم الملک کو مکہ معظمہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔ کچھ دن بعد لوٹے۔ مخدوم الملک تو گجرات ہی میں فوت ہو گئے۔ شیخ عبدالنبی دارالسلطنت میں پہنچے، جہاں پکڑ کر قید کیے گئے اور وہیں قیدخانہ میں ۹۹۲ھ میں انتقال کیا۔

قاضی شہاب الدین کے دوسرے نواسے شیخ رضی الدین تھے۔ انھوں نے بھی اپنے نانا ہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ فقہ و اصول اور علم کلام و عربیت میں دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ ابراہیم شاہ شرقی نے انھیں ردولی شریف کا قاضی بنا دیا تھا، بعد ازیں متوطن ہو گئے اور ساری عمر درس و افادہ میں بسر کی۔

تیسرے نواسے مولانا فخرالدین تھے۔ وہ جونپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں اپنے نانا (قاضی شہاب الدین) سے تعلیم حاصل کی اور ان کے فیضِ تلمذ سے فقہ و اصول اور عربیت و کلام میں تبحر حاصل [illegible]

ملک العلما کے تلامذہ

عزیز نواسوں کے علاوہ ملک العلما کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل افاضل کو خاص طور سے شہرت نصیب ہوئی:

۱۔ مولانا عبدالملک جونپوری: جون پور میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے ملک العلما [illegible] میں رہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سند فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوئے [illegible] عالم بے عدیل تھے۔ لہٰذا استاد کے بعد ان کے مدرسے میں اُن کے جانشین ہوئے۔ ۸۹۰ھ میں وفات پائی اور گھٹ گھر (جونپور) میں دفن ہوئے۔

مولانا عبدالملک کے شاگرد رشید میاں الہداد جونپوری تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی [illegible] فرماتے ہیں:

"از اعاظم علمائے جونپور است، شارح کافیہ و ہدایہ و مدارک۔ در تحریر [illegible] علمی [illegible] تمام دارد و بیک واسطہ شاگرد قاضی شہاب الدین است و مرید راجی حامد شاہ" (اخبار الاخیار ص ۱۹۷)

لہ سید شہاب الدین گرگ بیزی کی اولاد میں تھے۔ راجی کا نام اُن کے خاندان میں چلا آتا [illegible] حال میں سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے۔ آخر میں شیخ حسام الدین مانک پوری کے مرید ہو گئے تھے۔ ظاہری علم بقدر ضرورت رکھتے تھے (باقی بر صفحہ ۱۲۳)

Marfat.com

بعد فاتحہ فراغ عمر گرامی کا بیشتر حصّہ تالیف و تصنیف میں صرف کیا۔ مصنفات میں حاشیہ تفسیر مدارک شرح ہدایہ، شرح اصول بزدوی کے علاوہ ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ پر (جو حاشیہ ہندیہ کے نام سے مشہور تھی) حواشی بھی مشہور تھے[1]۔ لیکن صاحب اخبار الاخیار کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کافیہ ابن حاجب کی خود شرح لکھی تھی (شارح کافیہ) بہرحال آزاد بلگرامی اُن کے بارے میں کہتے ہیں:

"عمر گرامی را بیشتر بہ تدریس و تصنیف صرف ساخت و تصانیف رائقہ و تالیف فائقہ پرداخت مثل شرح ہدایہ فقہ در چند مجلد و شرح بزدوی و حواشی بر حواشی ہندیہ و حاشیہ تفسیر مدارک۔" (مآثر الکرام، ص ۱۹۲)

۲۔ مولانا علاء الدین جونپوری: عرصہ تک ملک العلما شہاب الدین سے تعلیم پائی۔ انھیں کے واسطے انھوں نے اپنی "کافیہ" کی مشہور شرح لکھی تھی۔ بیس سال کی عمر میں سند فراغ حاصل کی اور مسند درس و افتا پر متمکن ہوئے۔ اپنے عہد کے مشاہیر علمائے جونپور میں شمار کیے جاتے تھے۔ تصانیف میں شرح کافیہ پر (جو استاد نے اُن کے واسطے تصنیف کی تھی اور حاشیہ ہندیہ کے نام سے مشہور تھی) حاشیہ مشہور ہے۔

۳۔ شیخ محمد عیسیٰ: صدیقی النسب تھے۔ ۷۹۳ھ میں دہلی کے اندر پیدا ہوئے مگر حملہ تیموری کے زمانہ میں اُن کے [illegible] دیگر مشاہیر وقت کی طرح جونپور چلے گئے جہاں شیخ فتح اللہ الہ دادی کے مرید ہوئے[2]۔ شیخ فتح اللہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) لیکن دانشمندان وقت اُن کے مرید تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کسی مشکل مسئلہ کی تحقیق بیان فرماتے تو اپنی سرگذشت بیان کرنا شروع کر دیتے اور اسی ضمن میں اس مسئلہ کی وضاحت بھی ہو جاتی۔ اسی انداز سے مولانا الہ داد ان کے حلقہ ارادت میں آئے۔ مولانا الہ داد کے ایک ہم سبق شیخ حسن طاہر تھے جو راجی حامد شاہ کے مرید تھے۔ ایک دن مولانا الہ داد نے انھیں ملامت کی کہ پڑھا لکھا سب ڈبو دیا کہ ایک اَن پڑھ درویش کے حلقہ ارادت میں چلے گئے۔ شیخ حسن طاہر نے کہا ایک مرتبہ ذرا اُن کی خدمت میں چل کر دیکھ لو پھر ملامت کر لینا اور پھر بقول شیخ عبدالحق "روز دیگر ہر دو قصد ملازمت کردند۔ مولانا الہ داد مسئلہ چند از ہدایہ و بزدوی کہ بسمت اشکال موسوم بودند، تصور کردہ با خود راست کرد۔ چوں بخدمت سید رسیدند، او بہماں عادت خود از سرگذشت احوال خود حکایت آغاز کرد کہ متضمن رفع اشکالات مولانا الہ داد گردید۔ مولانا نیز مرید شد و بسلوک طریق مجاہدہ و ریاضت مشغول گشت۔" (اخبار الاخیار، ص ۱۹۷)۔ مولانا الہ داد کے مرید شیخ معروف جونپوری تھے اور ان کے مرید شیخ احمد زین۔

[1] مآثر الکرام صفحہ ۱۹۲۔ [2] خلیفہ شیخ صدر الدین حکیم است۔ در اوائل حال از علمائے دہلی بود۔ سالہا در مسجد جامع دہلی پائیں منار شمسی بر مسند درس و افادت جا داشت و در آخر مرید شیخ صدر الدین حکیم شد و بسلوک ایں طریقہ مشغول گشت۔" (اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۸) شیخ صدر الدین حکیم شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے اجل خلفا میں سے تھے۔

Marfat.com

انھیں علوم شرعیہ کی تکمیل کا حکم دیا اور شیخ محمد عیسیٰ نے جا کر ملک العلما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ انھیں بھی اُن سے بے حد انس و محبت تھی۔ ملک العلما کی تصانیف میں اصول بزدوی کی شرح مشہور ہے۔ یہ شرح جو بحث امر تک ہے ملک العلما نے شیخ محمد عیسیٰ ہی کے لیے لکھی تھی۔ علوم شرعیہ کی تکمیل کے بعد پھر شیخ کی خدمت میں پہنچے اور تصفیہ باطن میں مشغول ہو گئے[۱] اسی ترک و تجرید اور ریاضت و مجاہدہ کی زندگی کے بعد ۸۷۰ھ میں وفات پائی۔ امرا و سلاطین سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ ہر دم مراقبہ میں رہتے تھے، یہاں تک کہ چہرہ گرد ان اللہ آیا تھا اور ٹھوڑی سینہ سے لگ گئی تھی۔ اکثر یہ شعر ورد زبان رہتے تھے ؎

من فقر خود بملک سلیماں نمی دہم — من دلق خود بافسر شاہاں نمی دہم

ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم — از رنج فقر در دل گنجے کہ یافتم

شیخ محمد عیسیٰ کے مریدانِ باصفا میں شیخ بہاءالدین جونپوری[۲] اور شیخ مبارک بنارسی مشہور تھے۔

۴۔ قاضی سماءالدین جونپوری: قاضی شہاب الدینؒ کے براہ راست شاگرد تو نہیں تھے لیکن اُن کے تلامذہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے عہد کے اکابر علما میں سے تھے۔ آخری شرقی سلطان حسین شاہ ان کا شاگرد تھا۔ چنانچہ تخت نشین ہونے پر اس نے اُن کے فہم و ذکا سے متاثر ہو کر اپنا وزیر بنا لیا تھا اور قتلغ خاں کا خطاب دیا تھا۔ حسین شرقی اور بہلول لودھی سے جو معرکے ہوئے قتلغ خاں (قاضی سماءالدین) اُن میں موجود تھے۔ اور ۸۸۱ھ کے آخری معرکہ میں قید ہوئے۔

رسمی علوم میں تبحر کے علاوہ اصابت رائے اور حسن تدبیر کے ساتھ متصف تھے۔ فرشتہ نے لکھا ہے

[۱] شیخ محمد عیسیٰ از کبار مشائخ جونپور است۔ مرید شیخ فتح اللہ اودھی است۔ والد او شیخ احمد عیسیٰ از اکابر دہلی است۔ در فترتے کہ از آمدن امیر تیمور بصوب دہلی افتاد، اکثرے از اکابر بجانب جونپور رفتند۔ و او نیز در آں میاں بود، و او شیخ محمد عیسیٰ در آں زمان ہفت ہشت سالہ بود۔ و ہم در سن صغر بمقتضی سعادت ازلی و استعداد جبلی مرید شیخ فتح اللہ شد، و باوجود آں باشارت پیر مدتے پیش ملک العلما قاضی شہاب الدین تلمذ کرد و شرح اصول بزدوی کہ قاضی تا بحث امر دارد، بتقریب او نوشتہ است و بعد از فراغ از تحصیل علم ظاہر در خدمت شیخ بتصفیہ باطن مشغول شد"

(اخبار الاخیار صفحہ ۱۸۰)

[۲] شیخ بہاءالدین جونپوری از مشاہیر مشائخ آں دیار است۔ مرید شیخ محمد عیسیٰ است در ترک و تجرید بصدق و دوام قدمے داشت (اخبار الاخیار صفحہ ۱۹۷)

Marfat.com

گرجب بہلول لودھی نے اپنی وفات کے قریب امراء کے دباؤ سے سکندر لودھی کو ولی عہدی سے معزول کرنا چاہا اور اسے دہلی سے بلایا تو سکندر لودھی نے قتلغ خاں ہی سے مشورہ کیا اور انھیں کی رائے پر عمل کیا۔

"سلطان سکندر بقتلغ خاں وزیر سلطان حسین شرقی کہ دستگیر شدہ در دہلی محبوس بود باصابت رائے اختیار دفخت مشورت کرد۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول، صفحہ ۱۷۸)

لیکن اولاد امجاد اور تلامذہ کرام سے زیادہ دیرپا ورثہ ملک العلما نے اپنی تصانیف عالیہ کی شکل میں چھوڑا۔

(ثقافت، لاہور ـــ فروری ۱۹۶۷ء)

Marfat.com

مُلّا محمودؔ جونپوری

کی

سوانح حیات کے بعض نئے مآخذ

ملا محمود جونپوری کی شہرت بحیثیت ایک عظیم فلسفی کے مسلم الثبوت ہے، وہ نہ صرف اسلامی عہد کے ہندوستان کے عظیم ترین فلسفی تھے، بلکہ اسلامی فکر کی تاریخ میں جن عباقرہ نے فکر انسانی کی ثروت میں اضافے کئے ہیں، ان میں بھی اسکا ایک ممتاز مقام ہے۔ اس عہد کے نصف اوّل تک انکی مایۂ ناز تصنیف "الشمس البازغہ" عربی مدارس میں داخل درس اور علماء و فضلاء کی بحث و تمحیص کا ایک اہم موضوع تھی، اور نہ صرف خواص ہی اس کی عظمت کے آگے سر احترام خم کرتے تھے، بلکہ عوام میں بھی اس کی جلالت قدر مسلّم تھی۔ وہ نہ صرف سنجیدہ جگرکاوی کا "Symbol" (علامت) تھی، بلکہ اس کا منتہائے کمال سمجھی جاتی تھی۔

آخری زمانہ میں بھی جب جدید کا قدیم سے ناطہ ٹوٹ چکا تھا اور فضلائے عہد اپنے اسلاف کی علمی و فکری کاوشوں کو بالکل بھلا چکے تھے، وہ ملا محمود جونپوریؒ کی عظمت قدر اور تفکیری سرگرمیوں کے باب میں ان کے انفرادیت کو فراموش نہ کرسکے، چنانچہ جب علامہ اقبال کو معلوم ہوا کہ مسئلہ زمان کے بارے میں اسلامی عہد کے ہندوستان کے فضلا؟ قدر فکری کارنامے انجام دئے ہیں تو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور دریافت کیا:۔

"ملا محمود جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفر بھی ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے، ان کے اسماء سے مطلع فرمائیے۔ اگر ممکن ہوسکے تو ان کی بڑی تصانیف سے بھی" (مکتوب اقبال بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۸ اگست ۱۹۳۳ء بحوالہ معارف اکتوبر ۱۹۵۴ء ص ۲۱۲)

Marfat.com

(۱)

فاضل جونپوری کی سوانح حیات کا ایک نیا ماخذ مجھے جس ماخذ کو متعارف کرانا ہے وہ نہ تو "میخانۂ تسخیر" کی طرح قدیم یا اس سے اقدم ہے اور نہ قاضی صاحب کے گنائے ہوئے دوسرے ماخذوں کی طرح تفصیلی، بایں ہمہ قدیم بھی ہے اور اس میں فاضل جونپوری کی علمی زندگی سے متعلق ایسے واقعات بھی مذکور ہیں جو دوسرے تذکروں و تراجم میں نہیں ملتے،

امام الدین ریاضی عربی مدارس کے اساتذہ وطلبہ میں "التصریح فی الہیئۃ" کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں، وہ تاج محل آگرہ کے مشہور معمار استاد احمد کے پوتے اور اس علمی خاندان کے ایک فرد فرید تھے، ان کے حالات زندگی پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور نے ایک سیر حاصل مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، مگر اس میں ان کی صرف دو تین کتابوں ہی کا نام ہے،

لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ان کی ایک اور نادر تصنیف کا پتہ چلا ہے جو شعراء کے علاوہ علماء وفضلاء کے تذکرے پر بھی مشتمل ہے، ان میں سے بہت سے فضلاء سے ان کے براہ راست تعلقات تھے، باقی کے حالات میں ان کا ماخذ اپنے پدر بزرگوار لطف اللہ مہندس کا تذکرہ ہے، لطف اللہ مہندس، اپنے عہد کے اکابر علماء میں تھے اس لئے ان کے دوسرے معاصرین سے بھی

Marfat.com

تعلقات رہے ہوں گے، جہاں تک عہد شاہجہانی کے علماء و فضلاء کے حالات کا تعلق ہے یہ تذکرہ بہت زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے، اس تذکرہ کا نام "باغستان" ہے اور اس میں ملا محمود جونپوری کے حالات اسطرح مذکور ہیں،

"ملا محمود جونپوری در فروع و اصول و معقول و منقول بکمال رسیدہ بود و در تفسیر و حدیث و حکمت مہارت تمام داشت، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی با وجود کمال خود بکمال جامعیت او، اظہار اقرار و اعتراف بفضل و دانش او می نمود۔ فاضل محقق و کامل مدقق بود۔ عالم متوحد و عارف موحد مولوی عبدالحکیم در مناظرۂ علم توحید با وے مقاومت نداشت و می فرمود کہ مولانا نفس قدمی است نادر بود سخن را خاصہ معقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگران ز پیش او بمتقدّ ان اوهن البیوت لبیت العنکبوت ست بل ضعیف تر از نسج عنکبوت است۔"

(تذکرہ باغستان صفحہ ۶۸۴ ب، ۶۸۵ الف)

اس سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) تذکرہ باغستان کا سال تصنیف ۱۱۴۵ھ ہے، اس لئے یہ مولانا غلام علی آزاد کے دونوں تذکروں "سبحۃ المرجان" اور "مآثر الکرام" سے زیادہ قدیم ہے،

امام الدین ریاضی ایک صاحب تصنیف عالم تھے، اور اپنے روسائے تذکرہ کی علمی کاوشوں کو ذمہ داری کیساتھ پرکھنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، مولانا غلام علی آزاد بھی ایک جید عالم تھے مگر ان کے دوسرے مشاغل اس وقت نظر کی انہیں فرصت نہیں دیتے تھے، مثلاً علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا ایک مشہور رسالہ ہے "الدرۃ الثمینۃ" مولانا آزاد نے اس کے موضوع کے متعلق فرمایا ہے:۔

Marfat.com

"درثمینہ در اثبات واجب تعالیٰ"

حالانکہ اس رسالہ میں اثبات باری تعالیٰ سے قطعاً تعرض نہیں کیا گیا۔ "درثمینہ" کے مخطوطے بر صغیر کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں[1] اور ان کے مطالعے سے اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے اس کا موضوع ہے فلاسفہ کے موقف "قدم عالم"، "نفی علم واجب تعالیٰ بجزئیات مادیہ" اور "نفی حشر اجساد" کا ابطال، جیسا کہ رسالہ "الدرۃ الثمینہ" (جسکا دوسرا نام "الرسالۃ الخاقانیۃ" بھی ہے) کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے، اگرچہ علامہ سیالکوٹی نے اس کے اندر پہلے اور تیسرے مسئلے (یعنی قدم عالم اور نفی حشر اجساد) سے یونہی سا تعرض کیا ہے، زیادہ زور "علم واجب تعالیٰ بجزئیات مادیہ" پر دیا ہے، اور اسی وجہ سے بعض اہل علم نے اسے "در علم واجب تعالیٰ" بتایا ہے،

امام الدین ریاضی نے نہ صرف اس کی تفصیل دی ہے بلکہ اس کی تصنیف کے علمی و تاریخی پس منظر کو بھی وضاحت کیساتھ بتایا ہے، انھوں نے علامی سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں کا وہ خط بھی نقل کیا ہے، جس کی تعمیل میں علامہ سیالکوٹی نے یہ رسالہ لکھا تھا، رضا لائبریری رامپور میں "الدرۃ الثمینہ" کا جو مخطوطہ ہے، اس میں بھی سعد اللہ خاں کا یہ خط موجود ہے،

اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہر چند آزاد کے دونوں تذکروں پر بعد کے لوگوں نے غیر مشروط اعتماد کیا ہے، اور اس عہد کی علمی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک ولعد ماخذ کی حیثیت دی ہے، اس کے باوجود امام الدین ریاضی کا یہ تذکرہ (باغستان) نہ صرف ان سے قدیم ہے، بلکہ زیادہ مستند بھی ہے،

---

[1] اس رسالہ کو مولوی احمد علی شوق نے معارف برائے اکتوبر ۱۹۲۳ء میں "اسلامی ہندوستان کی علمی خودداری الدرۃ الثمینہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہجہاں اور نواب سعد اللہ خاں" کے عنوان سے متعارف کرایا تھا بعد میں راقم الحروف نے اسی عنوان سے اس پر معارف ستمبر ۱۹۷۶ء جون، جولائی، اگست ۱۹۷۷ء میں تعقب کیا۔

(۴) ملا محمود جونپوری ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ہمعصر تھے، دونوں کے سنین وفات سے خیال ہوتا ہے کہ شاید موخر الذکر مقدم الذکر سے عمر میں چھوٹے ہوں[۱]. کیونکہ حسب تصریح مولانا غلام علی آزاد ملا محمود کا انتقال ۱۰۶۲ھ میں اور ملا عبدالحکیم کا ۱۰۶۷ھ میں ہوا تھا لیکن عہد جہانگیری کے مشاہیر علما و فضلا میں علامہ سیالکوٹی کا نام تو ملتا ہے، چنانچہ معتمد خاں ساقی نے "اقبالنامہ جہانگیری" کے آخر میں "ذکر فضلائے عہد" کے زیر عنوان لکھا ہے، .... ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ ... مگر اس ذکر فضلائے عہد میں ملا محمود جونپوری کا نام نہیں ملتا۔

ہو سکتا ہے کہ اسے جہانگیر کی بے توجہی پر محمول کیا جائے جیسا کہ "بادشاہنامہ" میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرے میں عبدالحمید لاہوری کی صراحت سے مترشح ہوتا ہے

"در ایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بقدر دریافت معیشت در ساختہ عزلت گزیں بود"[۲]

مگر اس کی توجیہ تو یہ کی جا سکتی ہے کہ جس زمانہ میں "اقبالنامہ" مرتب ہو رہا تھا[۳] ملا محمود جونپوری کم عمر[۴] تھے اور فارغ التحصیل ہوئے مشکل[۵] سے چار سال ہوئے تھے......

---

۱. حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ملا محمود جونپوری ۱۰۱۰ھ میں پیدا ہوئے تھے جب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی فارغ التحصیل ہو چکے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ علامہ سیالکوٹی کے استاد ملا کمال الدین کشمیری کا ۱۰۱۷ھ میں انتقال ہو چکا تھا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)۔ ۲. بادشاہنامہ جلد اول صفحہ ۳۴۱۔ بادشاہنامہ ہی سے مولانا غلام علی آزاد نے نقل کیا ہے "در عہد جہانگیری بہ معاش ضروری ساختہ در وطن مالوف بسر می برد" (ماثر الکرام صفحہ ۲۰۴)۔

۳. شاہجہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ اسی زمانہ میں جہانگیر نے وفات پائی لہٰذا اس سے کچھ پہلے غالباً ۱۰۳۶ھ کے قریب اقبالنامہ مرتب ہوا ہوگا۔ ۴. ملا محمود علی صبح الانقان (حسب تصریح "شمس بازغہ" بحوالہ معارف جون ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۲۲) ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے تھے: "ولادت باسعادتش در ماہ مبارک سنہ ہزار و پانزدہ واقع شدہ" اسلئے ۱۰۳۶ھ میں ان کی عمر اکیس سال ہوگی۔ ۵. ملا صاحب نے سترہ سال کی عمر میں فاتحہ فراغ پڑھا تھا۔

"در ہفدہ سالگی فاتحہ الفراغ خواندند: تلامذہ علمائے اثنا عشری: سلاطین الحکمائے منابین گشت"

(تجلی نور بحوالہ المعارف جون ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۳۰)

Marfat.com

اس لئے شاید ان کے تبحر علمی نے اتنی شہرت حاصل نہ کی ہو کہ ان کا ذکر خیر دربار کے وقائع میں ثبت کیا جاتا، ان کے مقابلے میں ملا عبدالحکیم بیس[2] سال سے زائد عرصہ[1] سے نہ صرف تعلیم و تدریس بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی ید طولیٰ حاصل کر چکے تھے، البتہ حیرت اس پر ہے کہ عبدالحمید لاہوری نے بھی "بادشاہنامہ" میں ملا محمود کو درخور اعتنا نہیں سمجھا حالانکہ جس زمانہ میں یہ تاریخ مرتب ہو رہی تھی اسوقت وہ[3] "الامام الاعظم والمولی المکرم ..... السراج الوهاج فی الملة الحنیفیة والبحر المواج فی العلوم الحقیقیة .... ملک العلماء الراسخین[4]" کا مصداق بن چکے تھے، اس کے برعکس ملا عبدالحکیم کا مستقل ترجمہ دونوں جلدوں کے آخر میں فضلائے عہد کے ضمن میں دیا ہے[5] اس کے علاوہ دربار کے واقعات میں دو مرتبہ بارگاہ شاہجہانی میں انکی آمد و باریابی اور انعام و اکرام سے سرفرازی کا بھی ذکر کیا ہے، پہلی مرتبہ سال ۱۰۵۰ھ کے واقعات میں :-

---

۱؎ ملا عبدالحکیم ملا کمال الدین کشمیری کے شاگرد تھے چنانچہ واقعات کشمیر میں مرقوم ہے۔ "مطلع الانوار لایزال اخوند ملا کمال برادر مولانا جمال است ..... علمائے بسیار مثل مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی از خدمتش مستفید گردیدند" اسی طرح آزاد بلگرامی نے انکے (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے) تذکرے میں لکھا ہے، "در عنفوان سن تمیز دامن ہمت بہ طلب علم بر زد و بیشتر نزد ملا کمال الدین کشمیری ..... تلمذ نمود، مآثر الکرام ص ۲۰۴" ملا کمال الدین نے ۱۰۱۷ھ میں وفات پائی اسلئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ۱۰۱۷ھ سے پہلے ہی فارغ التحصیل ہو چکے ہونگے، اسطرح ۱۰۴۰ء میں جب "اقبالنامہ" مرتب ہو رہا ہوگا انھیں تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہوئے بیس[20] سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہوگا اس عرصہ میں تعلیم و تدریس کے علاوہ انھوں نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی شروع کر دیا تھا، جیسا کہ تفسیر بیضاوی پر ان کے حاشیہ کے مقدمہ سے مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے اسکو لکھنا تو بہت پہلے شروع کر دیا تھا مگر معنون بادشاہ شاہجہاں کے نام کیا۔

۲؎ عبدالحمید لاہوری نے ۱۰۶۵ھ میں وفات پائی، اسکے "بادشاہنامہ" میں عہد شاہجہانی کے پہلے بیس[20] سال کی تاریخ ہے لہذا یہ تاریخ ۱۰۳۷ھ اور ۱۰۵۷ھ کے مابین مرتب ہوئی، اسوقت ملا محمود علمی دنیا میں اپنا منفرد مقام حاصل کر چکے تھے، وہ ۱۰۴۱ھ کے قریب شاہجہاں نے دربار میں آئے تھے اور اسے رصد بندی کیلئے آمادہ بھی کر لیا تھا، مگر وزیر کی دراندازی سے یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ۳؎ شیر و شکر، بحوالہ معارف مئی ۱۹۶۷ء صفحہ ۳۳۰۔ "شیر و شکر" ۱۰۴۱ھ کی تصنیف ہے یعنی "بادشاہنامہ" کے مرتب ہونے سے پہلے کی۔ ۴؎ ۵؎ بادشاہنامہ جلد اول ص ۳۴۷ و جلد دوم ص ۷۵۔

Marfat.com

"یازدہم صفر...... ملا عبدالحکیم سیالکوٹی برحمت خلعت شال و انعام دویست مہر سرافراز گشتہ بوطن مرخص گردید"[۱]

دوسری مرتبہ سال ۱۰۵۶ھ کے واقعات کے ضمن میں:-

"بست و چہارم صفر... ملا عبدالحکیم با خلعت و دویست مہر عنایت نمودہ بسیالکوٹ موطن او رخصت فرمودند"[۲]

ملا محمود جونپوری یقیناً صف دوم کے فاضل نہیں تھے، دربار شاہجہانی میں انھیں بھی بار حاصل تھا، مولانا غلام علی آزاد نے لکھا ہے کہ وہ شاہزادہ شجاع کے اتالیق تھے:-

"شاہ شجاع بن صاحب قران شاہجہاں نزد علامہ تلمذ کرد"[۳]

آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بلخ کی فتح سے کچھ پہلے دار السلطنت میں آئے تھے، اور بادشاہ کو رصدگاہ کی تعمیر پر آمادہ بھی کر لیا تھا مگر وزیر اعظم کی دراندازی سے یہ تجویز ہی بدلے کار نہ آسکی۔

"دادہ صاحب قران ثانی شاہجہاں را بہ رصد بستن راغب ساخت۔ وزیر از بعضے وجوہ رائے پادشاہ را بگردانید و گفت مہم بلخ در پیش است و خزائن فراواں مطلوب"[۴]

اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس بے اعتنائی کے پس پردہ درباری سیاست کارفرما تھی، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عہد شاہجہانی کے وزیر اعظم علامی سعد اللہ خاں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد رشید تھے، چنانچہ تذکرہ بلغاں میں ان کے شاگردوں کا ذکر علامی سعد اللہ خاں ہی سے شروع ہوتا ہے:-

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۱۶،

[۲] ،، ،، ،، ،، ،، (۵۰۱)

[۳] مآثر الکرام صفحہ ۲۰۳، [۴] مآثر الکرام صفحہ ۲۰۳

Marfat.com

"بالجملہ از رایات جلال او (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی) شاگردان صاحب کمال اند. از انجملہ است: ملا سعد اللہ مخاطب بسعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہان بادشاہ صاحب قران کہ نشان مذکور از فضل او نشان می دہد۔"

(باغستان صفحہ ۶۸۶ الف)

اگرچہ استاد نے شاگرد سے کوئی غلط کام نہ کرایا ہوگا، مگر ظاہر ہے شاگرد نے ضرور حق شاگردی ادا کرنے میں کوئی دریغ نہ کیا ہوگا۔ یوں بھی شاگرد کے فضل و کمال کا شہرہ استاد کی جلالت قدر کا سبب ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی کسی علمی مہم کی انجام دہی کا موقعہ آتا تو علامی کے مشورے سے ان کے استاد ملا عبدالحکیم ہی کو دربار میں بلایا جاتا۔

تاریخ نے اس قسم کے دو موقعوں کی تفصیل محفوظ رکھی ہے:۔

۱۔ جب ایران سے ملا شفیعائے آکر دربار شاہجہانی میں ملازمت اختیار کی، اور اپنے فضل و کمال سے "دانشمند خان" کا خطاب حاصل کیا تو "دانشمند خان" کی "دانشمندی" کا امتحان لینے کیلئے دربار شاہجہانی سے کسی فاضل اجل کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا۔ اس وقت قرعۂ فال وزیر اعظم کے استاد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کے نام پڑا۔ چنانچہ وہ بلائے گئے۔ اور "ایاک نعبد وایاک نستعین" کی مراد و مفہوم پر مناظرہ ہوا۔ آخر میں ملا عبدالحکیم (وزیر اعظم کے استاد) ہی کی فتح ہوئی اس سے ان کے علمی تبحر کے ساتھ ان کی طلاقت لسانی اور مناظرہ میں دستگاہ کا بھی غلغلہ بلند ہو گیا۔ امام الدین ریاضی نے تذکرہ باغستان میں لکھا ہے:۔

"آوردہ اند کہ بادشاہ شاہجہان ایشان (ملا عبدالحکیم) را از سیالکوٹ برائے مناظرۂ ملا شفیعا کہ تازہ از ولایت آمدہ بود (و خطاب دانشمند خان یافتہ بود) طلبید۔ ایشان آمدند و اجلاس علماء و فضلاء و حکماء شد، چون نوبت سخن بمولوی

Marfat.com

عبدالحکیم رسید و با دانشمند خاں مباحثہ شد، مراد ایاک نعبد و ایاک نستعین گفتگو بطول کشید۔ و بالآخر درستی قول مولوی و راستی سخن ایشاں بر بادشاہ و سائر امرا و علمائے عالی شان در حضور انجامید۔" (بادشاہ نامہ صفحہ ۶۸۰ الف)

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا فضل و کمال اور فن مناظرہ کے آداب اور اس کے داؤ پیچ میں انکی مہارت بھی مسلم، لیکن قلمروے شاہجہانی میں بمصداق "وفوق کل ذی علم علیم" ایک اور فاضل اجل بھی تھا جس کے تبحر علمی اور مناظرانہ حذاقت کے خود ملا عبدالحکیم بھی معترف تھے، چنانچہ امام الدین ریاضی نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے علم و عرفان کی تعریف کرنے کے بعد ملا محمود جونپوری کے بارے میں ان کا حسب ذیل اعتراف بھی نقل کیا ہے:۔

"عالم متوحد و عارف موحد مولوی عبدالحکیم در مناظرہ علم توحید با وے (ملا محمود جونپوری) مقاومت نداشت وی فرمود کہ مولانا نفس قدسی است تار و پو: سخن را خانہ منقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او بمعبد وقد ان اوہن البیوت لبیت العنکبوت سست تر از نسیج عنکبوت است"۔

(بادشاہ نامہ صفحہ ۶۸۴ ب - ۶۸۵ الف)

"افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کا انتخاب" ایک معمہ ہے جس کے حل میں قیاس آرائیوں اور "ظن" کے لئے کافی گنجائش ہے۔

۲۔ جب حکومت ایران سے تعلقات بحال کرنے کے لئے شاہجہاں نے جان نثار خاں کی سربراہی میں سفارت بھیجی تو اس سفارت میں دو کاپرداز محمد فاروق اشرف اور محب علی واقعہ نویس بھی تھے جنھیں اپنے علم و فضل بالخصوص معقولات میں دستگاہ عالی کا دعویٰ تھا، اس کے زعم میں یہ دونوں وزیر اعظم ایران خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق سے جو وہاں کے اعلم العلماء

بیٹھے الجھ گئے اور منھ کی کھائی، بقول علامی سعد اللہ خاں

" مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند واز مسلک معقولیت دور افتادند"

جب یہ خبر شاہجہاں کو پہنچی تو اسکو کمال صدمہ ہوا کیونکہ یہ ایرانی علم وفضل کے سامنے ہندوستانی فضل وکمال ہی کی سبکی نہیں بلکہ گویا خود مغل تاجدار ہندوستان اور اس کے دربار کی سبکی تھی۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "معارف" اعظم گڈھ بابت اگست ۱۹۲۸ء صفحات ۱۰۲-۱۱۸)

وزیر اعظم نے شاہی مزاج کے تکدر وانقباض کو دور کرنے کے لئے اس کی تلافی کی تجویز پیش کی۔ مگر اسوقت بھی ان کی جنبہ داری نے استاد کے علاوہ کسی اور فاضل کو اس امر خطیر کی انجام دہی کا اہل نہ سمجھا اور بادشاہ کے ایماء سے انھیں خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں ایک رسالہ تحریر کرنے پر مامور کیا۔ اس حکم کی تعمیل میں انھوں نے، الدرۃ الثمینہ لکھا جو رسالہ الخاقانیہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ "الدرۃ الثمینہ" واقعی ہندوستانی عبقریت کا گوہر بے بہا ہے۔

[ملاحظہ ہو (۱) راقم الحروف کا مقالہ "علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ان کے رسالہ الدرۃ الثمینہ کا تعارف" "شیرازہ" سرینگر، کشمیر، جنوری ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۴-۳۴، اور "The Padumat --ut-Thaminah of Mulla Abdul Hakim of Sialkot By Shabbir Ahmad Ghori, Published By the journal of Research Society of Pakistan, Lahore for October 1964, PP 47-48 especially 74-78.]

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسوقت قلمرو شاہجہانی میں ملا عبدالحکیم کے علاوہ ایسے علماء نہ تھے جو اس امر جلیل القدر کی انجام دہی کے اہل ہو سکتے۔ دوسرے افاضل کی تصانیف ہمارے سامنے نہیں ہیں، لہذا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، مگر دار الجہور جونپور کے رئیس

العاقرہ کے فضل وکمال کا "روشن سورج" آج بھی عربی مدارس کے اندر منتہی طلبہ کے فلسفہ وحکمت کے اعلیٰ نصاب میں شامل ہے، اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

اسلئے اگر یہ امر خطیر ملا محمود کو تفویض کیا جاتا تو شاید وہ زیادہ بہتر طور پر اس سے عہدہ برآ ہوتے۔ علامی سعد اللہ خاں نے ان مباحث کے عنوان بھی استاد کی سہولت کے لئے تجویز کر دیئے تھے جن پر ان سے روشنی ڈلوانا چاہتے تھے،

الف۔ احاطہ سائل متعلقہ بایں مطلب علمی از حضوری وحصولی،

ب۔ بودن علم عین عالم وعین معلوم باعتراف تعلق بجزئیات بروجہ کلی یا جزئی،

ج۔ تحریر آنکہ جزئیت وکلیت مفہوم تابع مدرک (بکسر را) یا تابع مدرک (بفتح را) و نسبت وحسب جزئی ہست یا نہ،

د۔ بیان آنکہ ادراک تعقلے است واحساسے نیست،

ہ۔ شمول علم بمغیبات ومتخصات از زمان وغیر آں۔

و۔ بقاء علم بمعلوم با تبدل زماں۔

ز۔ حضور زمانیات بجمیع اجزایہ من ازل الآزال الی ابد الآباد مع کونہ غیر قار۔

"الدرۃ الثمینہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو ان میں سے اکثر مباحث سے تعرض ہی نہیں کیا گیا اور اگر کیا گیا ہے تو کچھ یوں نہیں۔ ویسے بھی مدۃ العمر کی تدریس سے بحث ونظر کا ایک خاص انداز بن چکا تھا جس سے انحراف دشوار تھا اور اس انحراف کی کوشش قلیل عرصہ (در عرض دہ پانزدہ روز") میں تکلیف مالا یطاق تھی اور آخری مبحث سے تو علامہ سیالکوٹی نے سرے سے تعرض ہی نہیں کیا:

Marfat.com

و حضور زمان بجمیع اجزائہ من ازل الآزال الی ابد الآباد مع کونہ غیر قار۔"

یہ ایسا مبحث ہے جس پر "شمس بازغہ" کا فاضل مصنف ہی روشنی ڈال سکتا تھا، جس نے ایران کے عظیم المرتبت عبقری میر باقر داماد کے نظریہ "حدوث دہری" کے پرخچے اڑا کر ہندوستان کی اسلامی فکر میں ایک نئی علمی تحریک کا آغاز کیا جو عرصہ تک علمی حلقوں میں بڑی شد و مد سے چلتی رہی آخر میں ملا امان اللہ بنارسی نے دونوں فاضلوں کے موقف پر محاکمہ لکھکر اسے ختم کیا۔

ایسے مسلم الثبوت "افضل" کے ہوتے ہوئے مفضول کے انتخاب کی کیا توجیہ کیجائے خصوصاً جبکہ "مفضول" کو "افضل" کی افضلیت کا اعتراف بھی ہو:

"مولانا نفس قدسی است . تار و پود سخن را ...... ہمنوا لے بافتہ کہ کارنامۂ دیگراں پیش او بہ سست تر از نسج عنکبوت است۔"

اس لئے بالآخر یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس انتخاب کے پس پردہ بشریت کے تقاضے بھی کارفرما تھے، اور جب خود وزیر اعظم کا یہ وطیرہ ہو تو اس سے دربار کے دوسرے ارکین اور وقائع نویس کا متاثر ہونا بالکل فطری ہے جس کے اثرات سرکاری تاریخ میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں، اس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:-

بادشاہنامہ اصولی طور پر عہد شاہجہانی کے اہم سیاسی واقعات کا جائزہ ہے، ضمناً اس کی دونوں جلدوں کے آخر میں "ذکر فضلائے عہد" کے عنوان سے علماء مشاہیر کے مختصر تذکرے بھی ہیں، ان میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا تذکرہ بھی ہے مگر ملا محمود جونپوری کا کوئی ذکر نہیں ہے) وقائع نویس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جب بھی ملا عبدالحکیم شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کی آمد کو بڑے اہم واقعہ کی طرح درباری وقائع میں لکھا جاتا۔ عبدالحمید لاہوری نے اس طرح کے دو واقعے لکھے ہیں جن کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

Marfat.com

وزیراعظم کے استاد مکرم کی بیجا عزت افزائی کی انتہا یہ ہے کہ ان کے حریف بنجہ شکن کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ مگر اس سے اس فاضل اجل کے مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آتی۔

۲۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ملا محمود جونپوری فلسفہ و حکمت کے فاضل بے عدیل تھے، خصوصاً شمس بازغہ کے فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں شمول ہونے سے یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہو گیا ہے، پھر مولانا غلام علی آزاد نے "سبحۃ المرجان" اور "مآثر الکرام" میں انہیں "نقاوۂ علماء اشراقیین و سلالۂ حکماء مشائین" بتایا ہے جس سے تو وہ خالص حکیم و فلسفی ہی معلوم ہوتے ہیں، مگر امام الدین ریاضی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا محمود علوم حکمیہ کے بعد میں اور علوم دینیہ کے پہلے عالم المعی و فاضل لوذعی تھے، امام الدین ریاضی نے تفسیر و حدیث میں ان کی دستگاہ عالی سے ان کے تبحر علمی کے ذکر کی ابتدا کی ہے: "در تفسیر و حدیث و حکمت مہارت تمام داشت"

غالباً ملا محمود اپنی زندگی میں بھی بالخصوص اپنے خاندان میں عالم علوم دینیہ ہی کی حیثیت مشہور تھے، چنانچہ ان کے اولین سوانح نگار اور ہم عصر نبی تابعی ابوالخیر فاروقی نے حسب تصریح قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، ان کے بارے میں لکھا تھا:۔

"وہو الامام الاعظم والمولی المکرم، جامع المناقب، شمس المشارق والمغارب، السراج الوہاج فی الملۃ الحنیفیہ والبحر المولج فی العلوم الحقیقیہ، علم الہدیٰ و العلامۃ المقتدیٰ، ملک العلماء الراسخین، افتخار الملۃ والدین!!"

مگر قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں: غالب جس اردو کے ہمارے آقا غالب بن گئے تھے منوانے کے مستحق تھا ہے اور جس کی بنا پر ان کا کلام وید مقدس کا ثانی قرار پایا، اپنی زندگی بھر اسے "مجموعۂ بیرنگ من" ہی کہتے رہے، حضرت ملا محمود جونپوری کی بابت منہم فی التفسیر والحدیث اور السراج الوہاج فی الملۃ الحنیفیہ، ہونے کے باوجود نقاوۂ العلماء الاشراقیین و سلالۃ الحکماء المشائین، ہوا کی

حیثیت سے مشہور ہوئے اور ان کی "الفوائد" قبول عام تو درکنار معمولی شہرت بھی نہ حاصل کرسکی، شہرت نصیب ہوئی تو ان کی "شمس بازغہ" کو حتی کہ ذوق بھی فرما گئے،

"کرشمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر"

۴۔ ملا محمود جونپوری کو علم و ادب کے علاوہ معرفت و حقیقت کا بھی ذوق تھا جیسا کہ حاجی ابوالخیر صاحب نے لکھا ہے "والبحر المواج فی العلوم الحقیقیۃ"

انکے خاندان میں اس حقیقت و معرفت کا ہمیشہ سے چرچا تھا اور ان کے اسلاف اس راہ کے رہبر و بلکہ رہنما سمجھے جاتے تھے، مگر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اس ذوق کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس عہد کے مروجہ منہاج "توحید وجودی" کے منکر ان کے معاصر حریف ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اس کے علمبرداروں میں تھے، بادشاہ شاہجہاں جو غالباً حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر تھا شیخ ابن عربی کی عظمت فکر سے زیادہ واقف نہ تھا۔ اس لئے ایک دن ملا عبدالحکیم سے ان کے بارے میں دریافت کیا اور ان کے جواب سے بہت زیادہ متاثر ہوا، امام الدین ریاضی نے لکھا ہے۔

"آوردہ اند کہ بادشاہ مغفور از مولوی (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی) پرسید کہ شیخ ابن عربی چہ کسے بود۔ فرمود عرب ما معجزات آنحضرت از شق قمر و کلام جمادات و عدم ظل کہ از ترکہ نورانیت جسم لطیف مبارک است و امثال آں بسیار بود۔ و ما را ازیں معجزہ تواند بود کہ ابن عربی در دین محمدی ہست۔ والا اگر می خواست دعوی نبوت می کرد و باثبات می رسانید و کسے را یارائے تاب مناظرہ نبود"

(تذکرہ پاکستان صفحہ ۱۰۷ الف)

یہی نہیں بلکہ توحید وجودی کے موضوع پر ان کی تقریر کو خاص شہرت حاصل تھی، یہاں تک کہ بادشاہ عالمگیر بھی اس کے سننے کا مشتاق تھا، مگر ان کی زندگی میں بادشاہ کی یہ خواہش پوری

Marfat.com

نہ ہوسکی، البتہ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عبداللہ لبیب سے یہ تقریر سنی جیسا کہ امان اللہ حسینی ریاضی نے لکھا ہے:۔

"آوردہ اند کہ بادشاہ (عالمگیر) بدیشاں مولوی عبداللہ لبیب خلف الرشید ملا عبدالحکیم سیالکوٹی گفت کہ والد شما مسئلہ وحدت الوجود و چہ طور تحقیق شما کردہ اند، آنرا می خواہیم از زبان شما شنویم کہ گویا از مولوی مرحوم شنیدہ باشیم ایشاں خود دراں وقت بجواب اجمالے کہ مقتضائے وقت بود اکتفا کردند و گفتند کہ چوں ایں سخن شرح طلب است، اگر امر شود بزودی رسالہ موجزے درحل ایں رمز شگرف تحریر نمودہ بسمع مبارک رسانند، فرمودند: بہتر، چنانچہ آخوند در اندک فرصتے رسالہ بسیار خوب درحل مسئلہ وحدۃ الوجود تصنیف کردہ بغرض رسانیدند، و فقیر از ایشاں راہم دراں ایام دریافتہ واں رسالہ حاصل نمودہ بمطالعہ آوردہ "

(باغستان صفحہ ۶۸۲ ب)

ملا عبدالحکیم حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) کے ہم سبق تھے، دونوں بزرگ شروع میں اس توحید وجودی کے زبردست ترجمان تھے، یہاں تک کہ ملا عبدالحکیمؒ نے مجدد صاحب کو "اسد العلماء" کا خطاب دیا تھا، حضرت مجدد صاحب نے تو بعد میں اس مسلک سے رجوع کر لیا اور وحدۃ الشہود کے عقیدے کو اپنایا، مگر ملا عبدالحکیم آخر تک اسی عقیدہ قدیم پر جمے رہے،

ہندوستان کی اسلامی فکر میں وحدت الوجود کا عقیدہ عرصہ سے راسخ ہو چکا تھا، اس کی جڑیں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ تک پہونچی ہیں، مگر اکبر کی مذہبی بے راہروی سے اس عقیدہ کی اشاعت کو بہت زیادہ مدد ملی۔ وہ خود شیخ تاج الدین زکریا جو حضرت خلوت خاص میں

Marfat.com

یہ تقریر سنا کرتا تھا، ملا عبد الحکیم سیالکوٹیؒ اور ملا محمود جونپوریؒ کے زمانہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادی جو اس باب میں شہزادہ دارا شکوہ کے روحانی رہنما تھے، اس عقیدہ کے سرگرم مبلغ تھے، اور اسمیں دستگاہ عالی کی بنا پر شیخ ابن عربی ثانی کہے جاتے تھے،

الہ آباد، غازی پور اور جونپور ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں اور ایک علاقہ کے اکابر کا دوسرے علاقہ کے اکابر سے متاثر ہونا فطری ہے، مگر ملا محمود جونپوریؒ اپنی پختگی اور صلابت کی بنا پر "توحید وجودی" سے قطعاً متاثر نہ ہوئے اور اس کے تردید کے سرگرم مبلغ بنے رہے، یہاں تک کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹیؒ بھی اپنے علمی تبحر اور توحید وجودی کی ترجمانی میں ید طولیٰ رکھنے کے باوجود ان کے حریف پنجہ فگن نہ بن سکے، بلکہ اس موضوع پر مناظرے میں ان سے شکست فاش کھائی اور اس کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملا محمود جونپوریؒ کے تفوق علمی کا بھی اظہار کیا، جیسا کہ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے،

"عالم متوحد و عارف موحد مولوی عبد الحکیم در مناظرہ علم توحید با وے مقاومت نداشت وقتی فرمود کہ مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصہ معقولات بنوعے بافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او بمصداق ان اوہن البیوت لبیت العنکبوت سست تر از نسج عنکبوت است"، (باغستان صفحہ ۶۸۴ ب۔ ۶۸۵ الف)

(معارف: اکتوبر ۱۹۷۳ء)

Marfat.com

۲

زیرِ بحث موضوع کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم محمد صالح کمبوہ کی "عمل صالح" ہے جو اصولاً تو شاہجہاں کے عہد حکومت کی تاریخ ہے لیکن دوسرے مورخین کی روش کے مطابق اس کے آخر میں فضلائے عہد کے تراجم کا بھی التزام کیا گیا ہے۔

عہد شاہجہانی سے پہلے دس سال کی تاریخ مرزا امینائے قزوینی نے لکھی تھی، اس کے بعد پہلے بیس سال کی تاریخ عبدالحمید لاہوری نے لکھی، اور مورخین نے بھی اس عہد کی تاریخیں لکھیں، بعد میں عہد شاہجہانی کے تیس سال کی تاریخ محمد صالح کمبوہ نے "عمل صالح" کے نام سے مرتب کی "عمل صالح" ۱۰۷۰ھ میں مکمل ہوئی چنانچہ مصنف نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"در سال ہزار و ہفتاد ہجری از چمن آرائی ایں گلشن فیض فراغ یافتہ مہر نعت بارنج سپہر پیمائی بر افراختم" [۱]

اگرچہ بعد میں مصنف نے اس میں ۱۰۸۵ھ تک کے واقعات بڑھا دیے مگر اصولاً

۱؎ عمل صالح کمبوہ ص: ۵۔

یہ کتاب ۱۰۸۰ھ میں لکھی گئی، یعنی فاضل جونپوری کی سوانح حیات کے قدیم ترین ماخذ "شیر زشکر" کے کوئی چودہ[۱۸] سال بعد۔

عبدالحمید لاہوری نے جن وجوہ سے بھی ہو، ملا محمود جونپوری کو "بادشاہ نامہ" میں درخور ذکر واعتنا نہیں سمجھا، مگر محمد صالح نے اپنے پیشرو کے برخلاف ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، اور اس طرح اس کوتاہی کی تلافی کر دی ہے جو اس باب میں عبدالحمید لاہوری سے ظہور میں آئی تھی اگرچہ زمانہ کی عام روش کے مطابق ان کا انداز نگارش بھی مزین عبارات کا بڑا حسین وجمیل مرقع ہے مگر اس عبارت آرائی میں بھی بعض اوقات مختلف علماء و فضلاء کے متعلق بعض اہم تصریحات مل جاتی ہیں، جن سے ان کی شخصیتوں کے نکھار میں خاصی مدد مل سکتی ہے، جہاں تک فاضل جونپوری کا تعلق ہے یہ واقعات ان کی وفات کے آٹھ سال بعد ہی قلمبند ہوئے ہیں، ان کی صحت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش نہیں،

محمد صالح کنبو نے ملا محمود جونپوری کے بارے میں لکھا ہے :-

"سر دفتر علمائے خطۂ وجود ملا محمود"

کہ ضمیر پاکش معانی را مقام محمود است و سپہر فضل و دانش را کوکب مسعود۔ در شہر صفا پرور جونپور پذیرائی سرشت گردیدہ واز آغاز ایام شعور در ابداع بدایع حسنات سخن کوشیدہ۔ مظہر فضل سرمدی و منبع فیض ابدی بود۔ و در انواع فنون دانش خصوص علم معقول و منقول و ریاضی و طبیعی و الٰہی ہیچ کس از ارباب استعداد را قوت دعوی برابری بادے نبود۔ اگرچہ در خور دانش و بینش خود طلاقت زبان و تقریر لسان نداشت،

Marfat.com

اما قلم فیض رقمش در حالت تحریر تفسیر آیات کلام الٰہی و تعبیر حقائق اشیاء کما ہی بعنوان تصنیع و تفنن بکار می برد کہ بر نقش کلکش دعوی فضیلت معنی پردازی آن جناب را زبان می دہد و سحبان ارجمندش بعلاقۂ عزائب معنی در صدر انجمن و لبائے والا فطرتان اقامت انداز گشتہ ہر لفظش کہ در اثبات شرافت لطائف نفی (؟) نطق ناطق و معجزے صادق است، ابواب حیرت بر روئے روزگار می کشاید، (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۸۳-۳۸۴)

اس تذکرے سے فاضل جونپوری کے متعلق چند نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

ملا صاحب "تفسیر و حدیث اور حکمت" کے علاوہ فن ریاضی میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے،

"و در انواع فنون دانش خصوص علم معقول و منقول و ریاضی و طبیعی و الہٰی ہیچ کس از ارباب استعداد و در اقوت دعوی برابرے باوے نبود"۔[1]

محمد صالح کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم حکمیہ و فلسفہ میں طبعیات و الٰہیات کے علاوہ ملا محمود کو ریاضیات میں بھی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، وہ ریاضیات کی شاخ "علم الہیئت" میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، مگر غالباً ان کی تحقیق پسند طبیعت اس فن میں اگلے جانے والوں کی "تقلید" پر راضی نہیں ہوسکی، اس لئے جیسا کہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے: "وہ بادشاہ کو رصد بندی کے لئے آمادہ کرنے کے لئے دہلی تشریف لے گئے مگر وزیر کی دراندازی سے ان کی تجویز بار آور نہ ہوسکی"[2] اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

اپنے پیشرووں (ترک و افغان سلاطین دہلی) کے برخلاف مغل تاجداروں کو نجوم و ہیئت سے غیر معمولی دلچسپی تھی، بابر کے اسلاف میں الغ بیگ تو اپنی رصد گاہ،

---

[1] عمل صالح جلد اول ص ۳۸۳، [2] آزاد بلگرامی مآثر الکرام ص ۲۰۲،

Marfat.com

سمرقند (جس کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں) اور "زیج سلطانی" کی تدوین و ترتیب کے لئے مشہور ہے، جو اسلامی علم الہیئت کی تاریخ میں آخری اہم ترین رصدگاہ اور زیج تصور ہوتی ہیں۔ عبدالرزاق نے "مطلع السعدین" میں لکھا ہے:۔

مرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود...... با خواص حکماء و فحول عقلاء و مہندسان عطارد و ذکا و فیلسوفان مجسطی کش...... مثل...... قاضی زادہ رومی و...... مولانا علاء الدین علی قوشجی...... و مولانائے اعظم غیاث الدین جمشید کاشی و مولانائے معظم معین الدین...... انجمنے ساخت...... و بعد از تحصیل کمالات و تکمیل آلات میل انبساط رصد و استخراج زیج فرمود و در شمال سمرقند مائل بمشرق مقام لائق تعیین نمود...... و بنائے آں...... استحکام یافت[1]

اس رصدگاہ کی علمی و ہیئتی تحقیقات نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی رصدگاہ مراغہ کی دریافتوں اور ان کی مرتبہ "زیج ایلخانی" پر قابل قدر اضافے کئے۔ چنانچہ عبدالرزاق نے آگے چل کر لکھا:"

تقویم آفتاب و سائر کواکب را رصد کردہ بر زیج جدید ایلخانی کہ جناب حکمت مآب خواجہ نصیر الدین طوسی استخراج نمودہ بود، فوائد و لطائف افزود۔۔ و در تقویم آفتاب و کواکب دیگر تفاوت صریح ظاہر ساخت[2]"

اس کا نتیجہ تھا کہ اس کے مقابلے میں پچھلی ہیئتی جدولیں اور زیجیں تقویم پارینہ بن گئیں اور بعد کے علمائے ہیئت کا (نہ صرف عبدالرزاق کے زمانہ بلکہ رصدگاہ محمد شاہی اور زیج محمد شاہی کے زمانہ تک) اسی پر اعتماد کیا جاتا تھا، عبدالرزاق نے آخر میں لکھا ہے:۔

---

[1] عبدالرزاق: مطلع السعدین صفحہ ۲۲۷-۲۲۸۔ [2] مطلع السعدین صفحہ ۲۲۸۔

Marfat.com

• آن زیج تصحیح یافتہ باتمام رسید و بزیج سلطانی گورگانی موسوم شد و در میان جرگۂ صناعت تنجیم و اصحاب تقادیم معمول و متداول است"[۱]

اس تفصیل سے مغل تاجداروں کا ہیئت و نجوم کیساتھ غیر معمولی اعتنا واضح ہو گیا ہوگا ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد بابر نے ڈالی، وہ ہر چند کہ "الیف اصدق ام الانباء" کا قائل و عامل تھا، مگر لوازم دربار میں نجومی کا ہونا بھی داخل تھا اسلئے اس کے یہاں بھی محمد شریف نام کا منجم تھا اور اپنے خلاف طبیعت بادشاہ اُسے برداشت کرتا تھا، رانا سانگا کے ساتھ جنگ میں اگرچہ اس منجم نے بڑی ہمت شکن پیشین گوئیاں کی تھیں مگر فتح کے بعد جب دوسرے جان نثاروں کو دل کھول کر انعام و اکرام سے نوازا تو اس "شوم نفس منجم" کو بھی ایک لاکھ دے کر مغل دربار کی دیرینہ روایت کو برقرار رکھا، بابر اپنی خود نوشت سوانحعمری "بابر نامہ" میں لکھتا ہے:-

(و بعد از فتح) محمد شریف منجم کہ چہ نوع نقشہائے شوم راندہ بود بمبارکباد فتح آمدہ، دشنام بسیاری دادہ دل خود را خالی کردم..... چوں قدامت خدمتی داشت یک لک انعام کردہ رخصت دادم کہ در قلمروے من نہ ایستد" (بابر نامہ صفحہ ۲۱۴)

اور ہمایوں تو گویا "تبحر فی علم الہیئت" کا مظہر ہی تھا[۲]، ابوالفضل اس کے بارے میں لکھتا ہے:-

در اقسام علوم خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر و سہیم نداشتند - (اکبر نامہ جلد اول، ۱۲۲ ص)

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

---

[۱] جمع نسخہ یں صفحہ ۲۳۹، [۲] ابوالفضل اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۳۰۰ میں اسکے تذکرہ کا آغاز صنعت براعۃ استہلال سے کرتا ہے جس میں علم ہیئت کی مصطلحات کو استعمال کیا ہے: کرسی کرۂ اسرار ابدی و ازلی، مصفادہ اصطرلاب حکمت علمی و عملی"

Marfat.com

"از اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام داشتند علی الخصوص در اقسام علوم ریاضی آنحضرت را پایۂ بلند بود و ہموارہ با ارباب حکمت صحبت می داشتند و ممتاز ان علم ریاضی در پایۂ سریر والا کامیاب سعادت بودند"

(اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸)

یہاں تک کہ اسی شوق فضول میں اس کی موت واقع ہوئی ابوالفضل نے اس کے آخری دن کے پروگرام میں لکھا ہے:-

آخر روز جمعہ ربیع الاول سنہ نہصد و شصت و سہ...... جمعے از ریاضی دانان را طلب فرمودند، وآں شب مظنہ طلوع زہرہ بود، می خواستند کہ ملاحظہ فرمایند دینت حق طویت آں بود کہ چوں زہرہ طالع شود و ساعت مسعود گردد مجلس عالی داشتہ جمعے را بمناصب عالیہ امتیاز بخشند"[1]

مگر شام کے وقت زینہ سے اتر رہا تھا کہ پیر پھسلا اور راہی ملک عدم ہوا۔

اکبر نے کچھ تو خاندانی روایات کا اثر اور کچھ الحاد و بیراہ روی کے تحت علوم متداول کو ترک کر کے علوم حکیہ خصوصاً نجوم و حساب کی تعلیم و تعلّم کا حکم دیا۔

"حکم شد کہ الہیین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ نخوانند و عمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست، صرف نکنند"[2]

جہانگیر بھی اپنی خوش باشی کے باوجود (جو علم و حکمت کی سرپرستی سے بے اعتنائی برتنے کی مقتضی تھی) نجوم کا معتقد تھا، اس کا درباری جوتشی جوتکرائے تھا جسے وہ نہایت فراخدلی کے ساتھ نوازتا رہتا تھا، چنانچہ اس کے بارے میں اپنی عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے تزک"

---

[1] اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۶۳، [2] ذوالفقار اردستانی، دبستان المذاہب صفحہ ۳۲۸،

میں لکھتا ہے:۔

"بسیارے از احکام او (جوتک رائے) مطابق افتادہ کہ خالی از غرابت نیست، در یں واقعات بتقریبات ثبت شدہ، بنا بریں فرمودند کہ او را بزر کشیدند شش ہزار و پانصد روپیہ برآمد با نعام او مقرر گشت۔"
(تزک جہانگیری صفحہ ۳۲۹)

ان ہی اسلاف کا خلف الرشید شاہجہان تھا، نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتناء اس نے اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پایا تھا، اور شاید اسی اعتناء مفرط کا نتیجہ تھا کہ اسکے دوسرے سال جلوس (۱۰۳۸ھ-۱۶۲۹ء) میں ملا فرید منجم نے بادشاہ کے ایما، وزیر آصف جاہ کے زیر اہتمام اور اپنے بھائی ملا طیب نیز ہیئت اور جوتش کے ہندوستانی اور یونانی مکاتب کے ماہرین کی معاونت سے ایک نئی ہیئتی جدول بعنوان "زیج شاہجہانی" مرتب کرکے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور موصوف صد ہزار تحسین و آفریں [1] "طبقات شاہجہانی" میں ملا فرید کے تذکرے میں مرقوم ہے:۔

"ملا فرید منجم علیہ الرحمہ از علم و دانش خبرے تمام داشت و در جبر و تقسیم اعداد و علم حساب و نجوم نظیر نداشتہ و یگانۂ آفاق بودہ۔۔۔ و در آخر عمر زیجے بنام حضرت بادشاہ دین پناہ ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قرآن ثانی نوشتہ و از فضائل و کمالات خود نمونہ گذاشتہ۔" (طبقات شاہجہانی صفحہ ۵۳۱)

مزید تفصیل محمد صالح کنبوہ نے دی ہے، اس نے "دومیں سال جلوس" کے حالات میں لکھا ہے:۔

"از سوانح ایں احیان سعادت بے پایان ملا فرید منجم کہ در تحصیل فن

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۶۱،

ریاضی باوجود مناسبت طبیعی و موافقت طالعی بتوفیق الٰہی ریاضت تمام کشیدہ بود...... کتاب زیج شاہجہانی کہ از توجہ حضرت صاحبقرانی در اہتمام دستور اعظم آصف جاہی بہمراہی برادر خود ملا طیب و سایر ریاضی دانان روشن ہند و یونان باتمام رسانیدہ بود از نظر انور شاہنشاہ عالم دوم نیز اعظم گذرانیدہ و حسن سعی او بحل تحسین و احسان و بتوقیع قبول و استحسان وصول یافت۔"[1]

اس کتاب کے آگے زیج الغ بیگ بھی ماند پڑ کر رہ گئی اور اہل علم نے اپنی تقویموں کی تیاری میں اسی پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ کتاب کی افادیت اپنی جگہ، مگر اس علم سے بادشاہ شاہجہاں کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ اس نے اس کتاب کے ہندی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ محمد صالح آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"چوں اصول و ابواب این کتاب حسابی متضمن فوائد بے شمار و منافع بے حساب بود...۔ چنانچہ بالفعل اہل این فن از زیج الغ بیگی مستغنی شدہ استخراج تقاویم ازیں کرامت نامہ نامی می نمایند حسب الامر اقدس بقصد تعمیم نفع آں و سہولت تفہم و تفہیم بتعلم و تعلیم منجمان ہندی زبان رصد بنداں اقلیدس کشائے دور جو بیابان دقیقہ رس عبارت آنرا بلغت ہندی ترجمہ نمودند۔"[2]

بادشاہ کو ان امور سے اتنی دلچسپی تھی کہ دکن اور بلخ کی مسلسل جنگوں کے باوجود وہ ان کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا، چنانچہ اس نے ۱۶ ویں سال جلوس (۱۶۴۲ء)

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۶۰ ، [2] ایضاً ۳۶۲ ۔

Marfat.com

ہیں اوقات شبانروزی میں اصلاح کرائی جسے محمد صالح نے اس سال کے واقعات میں "قانون مجدد گھڑیالے شبانروزی" کے عنوان سے لکھا ہے[1] اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

عام طور سے دن آفتاب کے طلوع سے اس کے غروب تک کے عرصۂ زمانی کا نام ہے اور رات غروب سے طلوع تک کے عرصہ کا اور یہی نجومی روز و شب ہیں، مگر عملی زندگی میں دن طلوع آفتاب سے کچھ پہلے شروع ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب کے کچھ دیر بعد تک رہتا ہے، ان عملی ضرورتوں میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم فجر اور مغرب کی نمازیں اور ان کے اوقات کا لحاظ ہے، لہٰذا دیندار ماہرین توقیت و علم الہیئت نے ایسا مقرر کیا ہے کہ دن طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھڑی (۳۶ منٹ) قبل شروع ہو جاتا ہے اور غروب کے آدھی گھڑی (۱۲ منٹ) بعد تک رہتا ہے[2]،

لیکن خود دن اور رات کی مقدار سال کے مختلف ایام میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً عہد شاہجہانی میں لاہور کا بڑے سے بڑا دن ۳۵ گھڑی کا ہوتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی رات ۲۵ گھڑی کی، اسی اصول پر صبح اور شام کے گجر بجائے جاتے تھے،

مگر شاہجہاں کی دینداری اور اسلام پسندی نے جو فجر اور مغرب کی نمازوں کو مسنون اور مستحب اوقات میں ادا کرانے کی مقتضی تھی اس ضابطۂ متداولہ میں کچھ ترمیم کی۔ اور حکم دیا کہ صبح اور شام کے گجر تو حسب دستور بجتے رہیں مگر دن اور رات کی گھڑیوں کے پیمانوں کی تبدیل کر دی جائے اور ڈیڑھ گھڑی طلوع آفتاب سے قبل اور آدھی گھڑی غروب آفتاب کے بعد جو اہل تنجیم (ہیئت دانوں) کے نزدیک رات میں داخل ہیں، انھیں رات کی گھڑیوں سے کم کرکے دن کی گھڑیوں میں بڑھا دیا جائے، چنانچہ لاہور کا

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۰۸، [2] ایضاً جلد دوم صفحہ ۳۰۸،

Marfat.com

طویل ترین دن ۳۰ گھڑی کا ہوگیا، اسی طرح دوسرے شہروں، آگرہ، دہلی، کشمیر، کابل اور دولت آباد (دیوگری) کے دن بھی بڑھ گئے، محمد صالح نے اس قانون کے تحت لکھا ہے:۔

"چون دریں وقت ضابطۂ مذکورہ بر پیشگاہ خاطر صواب ناظر خاقان جہاں ...... پرتو افگند و تفاوت گھڑیہا بر فراز ظہور برآمد، از القائے ربانی و الہام آسمانی ضابطۂ دیگر کہ باعث ارتفاع تفاوت مقدار گھڑیہا و اختلاف پیمانہ موجب تشخیص وقت نماز فجر و مغرب، وفق سنت سنیہ باشد بادشاہ دین پناہ مقرر فرمودند کہ وقت نواختن گجر صبح و شام را بدستوری کہ گذارش یافت بحال داشتہ پیمانہ گھڑیہائے لیل و نہار مساوی المقدار کردانیدند و یک و نیم گھڑی پیش از طلوع آفتاب و نیم گھڑی بعد از غروب کہ نزد اہل تنجیم داخل شب است از عدد گھڑیہائے شب کم نمودہ بر گھڑیہائے روز افزودند، چنانچہ روز اطول اکبرآبادی و شش و شاہجہان آبادی و شش و نیم دو دارالسلطنت لاہوری و ہفت گھڑی و کابلی و ہفت و نیم گھڑی و کشمیری و ہشت گھڑی و در بلدۂ دولت آبادی و پنج گھڑی قرار یافت" (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۰۸)

ملا فرید نے "زیج شاہجہانی" مرتب کی تھی۔ مگر عملی طور پر ان کا اعتماد رصدگاہ الغ بیگ کے مبنی مشاہدات اور دریافتوں پر تھا، ضرورت ہمایوں کے زمانہ سے ایک نئی رصدگاہ قائم کرنے کی محسوس کی جارہی تھی، ابوالفضل نے بادشاہ ہمایوں کے بارے میں لکھا ہے:۔

" وآنحضرت را ارادہ بستن رصد مصمم بود و بسیارے از آلات رصدی ترتیب

دادہ بودند وچند جا محل رصد خیال فرمودہ بودند[۱]" مگر ابھی طلوع زہرا کے منظنہ" ہی میں قلعہ کی چھت پر چڑھ رہا تھا کہ پیام اجل آگیا۔ ان کے جانشین اکبر کو ان علوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور اگر امیر فتح اللہ شیرازی زندہ رہتے تو یہ منصوبہ عمل میں آجاتا، مگر ان کی موت (۹۹۶ھ) نے اسکے امکان کو بھی ختم کر دیا۔ امیر فتح اللہ کے شاگرد ملا حسن علی موصلی کے ساتھ استادی و شاگردی کا رشتہ ہونے کے باوجود ابوالفضل کا رویہ بڑا اہانت آمیز تھا[۲] اس لئے انھوں نے اپنی عافیت ملک چھوڑنے ہی میں سمجھی اور رصد گاہ تعمیر نہ ہو سکی۔ مگر اس کی ضرورت کا احساس مغل تاجداروں میں باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملتا رہا۔

بادشاہ کی اسی رغبت کی بنا پر ملا محمود جونپوری دہلی تشریف لے گئے، اور بادشاہ کو قیام رصد گاہ پر آمادہ کر لیا مگر اسی زمانہ میں بلخ کی مہم کی تیاری زور شور پر تھی، اسلئے وزیر کو بادشاہ کے اس علمی و ملکی کارنامہ کو انجام دینے سے باز رکھنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔[۳]

اب یا تو یہ حکمران وقت کی ذاتی رغبت اور خاندانی میلانات کے زیر اثر "الناس علی دین ملوکہم" کے ہمہ گیر قانون کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا یا پھر زمانہ کا مذاق ورجحان ہی اس بات کا مقتضی تھا کہ اس عہد کے اکثر و بیشتر علماء علوم متداولہ کے ساتھ ریاضی و ہیئت میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان "اکثر و بیشتر" علماء میں ملا محمود جونپوری اور ملا فرید منجم کے علاوہ بنگال سر سبد ملا علاء الملک تونی تھے جنھوں نے اپنی غیر معمولی دانش و بینش، علم و فضل کاروانی و سلیقہ مندی سے عہد شاہجہانی ہی میں "منصب ارجمند خاں سامانی و خطاب فاضل خانی" حاصل کر لیا تھا، اور شاہجہاں کے جانشین عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں "بپایہ وزارت کل ہندوستان" اور منصب پنج ہزاری تک پہونچے۔ محمد صالح نے ان کے علمی تبحر بالخصوص

---

[۱] اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸۔ [۲] منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۳۶۔ [۳] مآثر الکرام صفحہ ۲۰۲۔

ریاضی و ہیئت میں ان کی دستگاہ کے بارے میں لکھا ہے:۔

"در فنون حکمت مہارتے تمام داشت ۔۔۔ در حساب و جبر و مقابلہ ہیچ یکے با او یارئے مقابلہ نداشت و در ہیئت و ہندسہ کسے را با او نیرو ئے مقابلہ نبود و در فنون دانش و بینش مرتبۂ معلم ثالث بل رتبۂ عقل اول بہم رسانیدہ؛"
(عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۸۰)

علی مردان خاں نے خزانۂ عامرہ کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی دریائے راوی سے نہر نکالنے میں کامیابی حاصل نہیں کی، مگر علاء الملک نے اس کے نقائص کی اصلاح کر دی، محمد صالح نے لکھا ہے،

"حسب الحکم اشرف جامع کمالات صوری و معنوی ملا علاء الملک تونی کہ از آب تراز و و علوم غریبہ وقوف تمام دارد تا نہج کردہ نہر آورد علی مردان خاں را اجمال داشتہ سی دو کردہ راہ نو بر نمودہ آب و آخر آورد چنانچہ از سال شانزدہم جلوس تا حال کہ سال بیستم است آب و آخر بے فتور بہ باغات می رسد؛" (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۱۲)

ملا علاء الملک کو صناعت تنجیم میں خصوصیت سے مہارت تامہ حاصل تھی، محمد صالح لکھتے ہیں:۔

"جامع فضائل صوری و معنوی ملا علاء الملک تونی میر سامان کہ در صناعت تنجیم صاحب خبرۂ و مہارت کلی بودہ و در دقائق این فن ذو فنون درجہ علیا و ید طولیٰ داشتہ؛" (ایضاً صفحہ ۴۹۲)

مگر اسی مہارت کے باوجود علاء الملک جو یافرید منجم رصد بندی کی جرأت

Marfat.com

کسی فاضل کو نہ ہوئی، اور ہوئی تو ملا محمود جونپوری کو ہوئی، مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

وزیر کی دراندازی نے ساری تجویز چوپٹ کر دی[1]۔ ورنہ شاید رصدگاہ مراغہ اور رصدگاہ سمرقند سے بھی عظیم الشان رصدگاہ ہندوستان میں قائم ہو جاتی، اور رصدگاہ محمد شاہی کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

مگر فلسفہ "ما قبل الطبیعیات و ما بعد الطبیعیات" کے مسائل کی شرح و ایضاح میں غیر معمولی مشغولیت کی بنا پر اس عبقری روزگار کی ہیئتی صلاحیتیں منظر عام پر نہ آسکیں یوں بھی "شمس بازغہ" کی شہرت نے ان کی دیگر بلند پایہ تصانیف کو گوشہ گمنامی میں ڈال دیا چنانچہ آزاد بلگرامی نے ان کی صرف دو ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے:۔

"شمس بازغہ در حکمت و فرائد در فن بلاغت" اگرچہ یہ بھی فرماتے ہیں "کمیت قلم در میدان تصنیف جولاں دارد[2]"

ظاہر ہے کہ ان کے "کمیت قلم کی جولانی کا میدان تصنیف" صرف دو کتابوں میں محدود نہ ہوگا، اسی لئے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے فاضل جونپوری کے ترجمہ میں لکھا ہے:۔

"و من تصانیفہ مالم یطلع آزاد: الدرۃ الیادۃ فی الصورۃ والمادہ و رسالہ فی الکلی والجزئی و رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہا و رسالہ فارسیہ فی تحقیق القضاء والقدر و رسالہ فی وحدۃ	انکی وہ تصانیف جن سے آزاد بلگرامی واقف نہیں تھے، حسب ذیل ہیں:۔ الدرۃ الیادۃ فی الصورۃ والمادہ، رسالہ فی الکلی والجزئی، رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہا، فارسی رسالہ در تحقیق قضا و قدر، رسالہ

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۰۲، [2] ایضاً،

Marfat.com

الوجود وغیر ذلک[1]　　　　　　　فی وحدۃ الوجود، وغیرہ۔

اس "وغیر ذلک" سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے، اور اس کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں، جو "شمس بازغہ" کی وجہ سے شہرت نہ پا سکیں، ممکن ہے انہیں ریاضی وہیئت کے بھی کچھ رسائل ہوں، لیکن جب تک یہ "رسائل" سامنے نہیں آتے نہ تو ان کے موضوع کے متعلق کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بنیاد پر ان کی ریاضیاتی وہیئتی صلاحیتوں پر کوئی تبصرہ کیا جا سکتا ہے،

پھر بھی "شمس بازغہ" میں ان کے جستہ جستہ افادات سے اس فن کے اندر ان کی بالغ النظری کا اندازہ ہو سکتا ہے،

مثلاً کائنات کی تشکیل (ہیئت افلاک وکواکب) اور اجرام سماوی کی گردش وحرکت کا مسئلہ قدیم علم الہیئت کا ایک مہتم بالشان موضوع تھا، لیکن جس نہج سے ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں اس کی توضیح کی ہے وہ ایک انفرادی شان رکھتا ہے، کم از کم علم الہیئت کی متداول کتابوں میں یہ انداز توضیح نہیں ملتا۔ آجکل عربی مدارس کے نصاب میں علم ہیئت کی دو کتابیں داخل درس ہیں، امام الدین ریاضی کی "التصریح فی الہیئۃ" اور قاضی زادہ رومی کی "شرح چغمینی" اول الذکر شیخ بہاء الدین عاملی کے ایک متن متین "تشریح الافلاک" کی شرح ہے، شارح امام الدین ریاضی فاضل جونپوری سے بہت زیادہ متاخر ہیں، اس لئے مؤخر الذکر کے زمانہ میں "تصریح" کے رواج کا سوال ہی نہیں ہوتا، البتہ ماتن شیخ بہاء الدین عاملی، جو میر باقر داماد کے ہم عصر تھے، ملا محمود جونپوری کے معاصر متقدم تھے، صاحب

---

[1] شمس بازغہ ص ۱۰۰، مطبوعہ مجیدی برقی پریس دہلی ۱۳۵۳ھ،

Marfat.com

طبقات شاہجہانی" نے انھیں عہد جہانگیر کے علماء میں محسوب کیا ہے۔ غالباً ان کا رسالہ "تشریح الافلاک" جلد ہی ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی مقبول ہو گیا، اور ۱۰۵۵ھ میں ملا عصمت اللہ سہارنپوری نے "باب تشریح الافلاک" کے نام سے اس کی شرح لکھی جو آج سے کوئی نصف صدی پیشتر تک عربی مدارس میں "تصریح" و "شرح چغمینی" کے علاوہ لائق اعتنا سمجھی جاتی تھی، مگر یہ کتاب فاضل جونپوری کی وفات کے بعد تصنیف ہوئی، لہٰذا اس کے بھی ان کے پیش نظر ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، البتہ اس کا متن ان کے زمانہ میں تصنیف ہو چکا تھا، اور شاید ہندوستان میں متعارف بھی ہو گیا ہو گا، مگر حریفانہ چشمک کی بنا پر ان کی نظر میں اس کے درخور اعتنا ہونے کا امکان نہیں ہے۔

شرح چغمینی کا متن ساتویں صدی ہجری کے ایک فاضل وقت محمود بن محمد بن عمر الجغمینی کی تصنیف ہے "شرح چغمینی" بجائے خود ایک عظیم ریاضی داں و ماہر علم الہیئت قاضی زادہ رومی کی تصنیف ہے جو اپنے استاد میر سید شریف کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور غیاث الدین جمشید کاشی کی وفات کے بعد رصدگاہ الغ بیگ کے منتظم اعلیٰ رہے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو گیارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں کم از کم پورب میں اس کتاب کا رواج نہ تھا یا ملا محمود ہی نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا، "شمس بازغہ" سے تو ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے اس میں جن کتابوں کا اہتمام سے ذکر کیا ہے وہ ہیں: "شروح تذکرہ" اور "کتاب المجسطی"۔

اول الذکر کا حوالہ انھوں نے "افلاک جزئیہ" کی تعداد کے سلسلے میں دیا ہے مگر اس کی تصریح سے پیشتر بطلیموسی نظام ہیئت پر بالخصوص جس طرح وہ متاخر مسلمان

Marfat.com

ہیئت دانوں میں سمجھا جاتا تھا، ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا، اس کے لئے ہمیں آج کل ہی کی متداول ہیئت کی درسی کتابوں کو پیش نظر رکھنا ہے،

قاضی زادہ رومی نے ماتن (بلکہ جمہور ماہرین علم الہیئت و فلکیات) کے اتباع میں بتایا ہے کہ مرکز عالم میں کرۂ زمین واقع ہے، اس پر کرہ آب، اسی پر کرہ ہوا، اور کرہ ہوا پر کرہ نار محیط ہے، کرۂ نار کو فلک قمر احاطہ کئے ہوئے ہے، اسے فلک عطارد، اس پر فلک زہرہ، اس پر فلک شمس، اسے فلک مریخ، اسے فلک مشتری اور اسے فلک زحل محیط ہے، فلک زحل پر کواکب ثابتہ کا کرہ ہے اور سب کے آخر میں فلک اطلس ہے، اس طرح فلک قمر کے جوف میں عناصر اربعہ کے کرات ہیں اور کرہ نار کے اوپر افلاک نہگانہ تو بتو متلاصق انداز میں محیط ہیں۔

اس ضمن میں دو باتیں: ان افلاک کی تعداد اور ان کی ترتیب قابل غور ہیں، سوال یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کی دلیل کیا ہے؟

افلاک کلیہ کی تعداد کے بارے میں قاضی زادہ رومی نے لکھا ہے:۔

"والوجہ فی کونہا تسعۃ انہم وجدوا تسعۃ حرکات متخالفۃ فاثبتوا لکل منہا فلکا فی بادی نظرہم لانہم وجدوا فی بادی النظر تسع حرکات مختلفۃ فاثبتوا تسع افلاک اذفی وجدان حرکۃ الثوابت فی بادی النظر نظر"

(شرح چغمینی صفحہ ۲۲)

آسمانوں کے نو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین علم الہیئت نے (انکے اندر) نو باہم گر مختلف حرکتیں پائیں لہذا بادی النظر میں ہر ایک کے لئے ایک مستقل فلک ثابت کیا، یہ وجہ نہیں تھی کہ انھوں نے بادی النظر میں نو مختلف حرکتیں پائی ہوں اور اس بنیاد پر نو افلاک ثابت کئے ہوں کیونکہ بادی النظر میں ثوابت کے اندر کسی حرکت کا پایا جانا محل کلام اور مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

Marfat.com

ملا محمود کے معاصر مقدم شیخ بہار الدین عاملی نے عام ہیئت دانوں کا نظریہ لکھدیا ہے کہ

"العالم الجسمانی کرۃ منضدۃ من ثلث عشرۃ کرۃ متلاصقۃ اعلاہا الفلک الاطلس وہو کاسمہ غیر مکوکب ثم فلک الثوابت وکلہا مرکوزۃ فی ثخنہ بحیث یماس سطح اعظمہا سطحیہ المحدب والمقعر ثم السموات السبع للسیارات السبع المشہورۃ"۔	عالم جسمانی کروی الہیئت ہے جو ایک تیرے سے ملاصق (چپکے ہوئے) تیرہ کروں سے مرتب ہوا ہے، انہیں سب سے اوپر فلک اطلس ہے جو فلک اپنے نام کی طرح تاروں سے خالی ہے، پھر ثوابت ہے، اور جملہ کواکب ثابتہ اس کے ثخن میں اسطرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں سے عظیم ترین ستارے کی سطح اس کی (فلک ثوابت کی) سطح محدب اور سطح مقعر دونوں کی مماس ہوتی ہے، پھر سات آسمان ہیں
(التصریح فی الہیئۃ ص ۷۔۶)	جو مشہور سیارات ہفتگانہ کے واسطے ہیں۔

متاخرین میں امام الدین ریاضی نے لکھا ہے :۔

"ہذا جار علی مذاق الحکماء القائلین بالتسع ولیس لہم علی ذلک برہان"۔	(یہ بات) ان حکماء کے مذاق کے مطابق ہے جو نو افلاک کے قائل ہیں مگر اس خیال کے واسطے ان کے پاس کوئی دلیل و
(التصریح ص ۶)	برہان نہیں ہے ۔

اس "مذاق حکما" کی تقلید میں عوام کے اندر بھی آسمانوں کی تعداد نو ہی قرار پائی اور اس بات نے جلد ہی ایک حقیقت مسلمہ کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ ظہیر فاریابی اپنے ممدوح قزل ارسلان کی تعریف میں لکھتا ہے :۔

Marfat.com

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

اور ظہیر کی اس مبالغہ آرائی پر طنز کرتے ہوئے شیخ سعدی فرماتے ہیں:۔

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسماں نہی زیر پائے قزل ارسلاں

ان تصریحات کے مقابلے میں ملا محمود کی توجیہ ہے، انھوں نے پہلے تو ایک عام فلکیاتی مشاہدہ کی دعوت دی ہے:۔

"واعلم ان ہذہ الاجرام النیرۃ لاسیما الثابتۃ نجدہا فی بادی الرأی متحرکۃ من المشرق نحو المغرب بحرکۃ سریعۃ جداً یتم الدورۃ فی قریب من یوم بلیلۃ ثم نجد السیارات تتبدل من التحدیق مختلفا عن ہذہ الحرکۃ باقدار متخالفۃ فیما بینہا فیکون لکل منہا فلک غیر الفلک المتحرک بالسریعۃ"

جاننا چاہئے کہ یہ روشن و درخشاں اجرام بالخصوص وہ جو ثوابت کے نام سے موسوم ہیں ہم انھیں بادی النظر میں مشرق سے مغرب کی جانب بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے پاتے ہیں اور انکا دور تقریباً ایک دن رات میں مکمل ہو جاتا ہے، پھر ہم ذرا غائر نظر سے دیکھنے کے بعد کواکب سیارہ کو بھی مذکورالصدر حرکت سے مختلف اور پچھڑا ہوا پاتے ہیں اور یہ اختلافات بھی آپس میں مختلف ہوتے ہیں۔ پس ان میں سے ہر ایک حرکت کیلئے لامحالہ ایک مستقل فلک ہوگا جو اس فلک سے بالکل مغائر اور جدا گانہ جو انتہائی تیز حرکت (حرکت یومیہ) سے چکر لگاتا ہے۔

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

پھر ان متخالفۃ المقدار حرکتوں کی توجیہ کے لئے دو نظریے پیش کئے ہیں:۔

"فاما ان يكون افلاكها ايضاً متحركة من المشرق
الى المغرب من غير ان يتحرك بالحركة
الاولى بل بحركة ناقصة فى السرعة منها
بقدر ما يتخلف عنها كما توهمه بعض الاوائل
وجرى عليه بعض المنتمين الى الحكمة فى
الاسلام او ان تكون متحركة من المغرب
نحو المشرق مع تحركها بالعرض بالحركة الاولى
فيكون المحسوس من المتخلف هو فضل الاولى
على هذه الحركات "

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اب یا تو ان کے (ان حرکات سے وابستہ) افلاک
بھی مشرق سے مغرب کی جانب حرکت کرتے
ہوں بغیر اس بات کے حرکت اولیٰ کے ساتھ
متحرک ہوں بلکہ ایک کمتر سریع حرکت کیساتھ
جو اپنی تیزی میں کچھ ناقص ہو اور اسکی مقدار
اس کمی کے برابر ہوتی ہے جتنا کہ وہ اس
(حرکت اولیٰ) سے پیچھے رہ جاتے ہیں جیسا
کہ بعض قدمائے فلکیین کا خیال تھا یا جیسا کہ
عہد اسلام میں بعض ایسے لوگوں کا خیال
تھا جو اپنی حکمت و دانائی کیطرف نسبت
کرتے تھے یا پھر مغرب سے مشرق کی جانب
حرکت کرتے ہوں معہذا حرکت اولیٰ کے
ساتھ بھی گردش کرتے ہوں. لہذا ان کے
حرکت اولیٰ سے پیچھے رہ جانے کی مقدار
اتنی محسوس ہوتی ہو جو حرکت اولیٰ اور
ان (کواکب سیارہ) کی حرکات کے فرق
کے برابر ہو ،

اس کے بعد ان دونوں نظریوں پر تنقید کی ہے اور خالی از سقم نظریہ کو متعین کیا ہے ،

" والاول باطل والالحفظ کل منها مطلقاً " اس میں سے پہلی شق باطل ہے ورنہ ہر سیارہ

Marfat.com

واحداً او مغرباً كذلك ولم يختلف غاية
ارتفاع كل فى الفصول والايام فتعين
الثانى"

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

کی جائے طلوع ایک ہی رہتی اور اسی طرح
جائے غروب بھی ایک ہی رہتی اور مختلف
فصلوں یا دنوں میں ہر ایک سیارے کی
غایت ارتفاع نہ بدلا کرتی۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ ان کواکب سیارہ کی حرکت فلک الکل کی حرکت کے مختلف جہات میں ہو فرماتے ہیں:۔

"ويكون هذه الحركات على مناطق واقطاب
غير منطقة الاولى وقطبيها"

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اور سیاروں کی یہ حرکتیں ایسے مناطق اور
قطبوں پر ہوتی ہیں جو حرکت اولی کے منطقہ
اور اس کے قطبوں سے مختلف ہیں۔

لیکن اس طرح آٹھ آسمانوں کے ثبوت کی گنجائش نکلتی ہے حالانکہ حکماء کے مذاق کے مطابق ان کی تعداد نو ہے، اس لئے وہ ایک دقیق تر مشاہدہ کی دعوت دیتے ہیں جو کواکب ثابتہ کی حرکت کا مثبت ہے:۔

"ثم انهم وجدوا الثوابت بدقيق النظر
تختلف فى مدة طويلة قدراً يسيراً جداً عما
يقتضيه الحركة الاولى يتخلف ابعادها
بالنسبة الى منطقتها وقطبيها لكنها لا تتخالف
فيما بينها۔ فاثبتوا لها ايضاً فلكاً آخر يتحرك
من المغرب الى المشرق بمثل ما مر فى السيارات
فثبت تسعة افلاك: واحد منها يتحرك

پھر جب انھوں نے بنظر دقیق دیکھا تو معلوم
کیا کہ کواکب ثابتہ بھی مدت طویل کے بعد اس
حرکت کے مقابلہ میں جو حرکت اولی کا مقتضی
ہے کچھ تھوڑے سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور
اس کے منطقہ اور قطبوں کے لحاظ سے اپنی
دوری کو برقرار نہیں رکھ پاتے لیکن باہم
آپس میں ایک دوسرے سے نہیں بچھڑتے،

Marfat.com

بالحرکۃ الاولی من المشرق الی المغرب
ویحرک الکل و بالحری ان یکون محیطاً
بالکل و محدداً للجہات حافظاً بحرکۃ
السریعۃ جداً للزمان ، و ثمانیۃ یتحرک
من المغرب الی المشرق : واحداً منہا
للثوابت و سبعۃ للسیارات السبع"

(ان کا باہمی فاصلہ غیر متبدل رہتا ہے)
تو انھوں نے (قدیم ہیئت دانوں نے)
ان (کواکب ثابتہ) کے لئے ایک مستقل فلک
ثابت کیا جو مغرب سے مشرق کی طرف گردش
کرتا ہے جیسا کہ کواکب سیارہ کے سلسلے میں
اوپر گذرا۔ اس طرح نو آسمان ثابت ہوئے،
ان میں سے ایک حرکت اولی کے ساتھ مشرق
سے مغرب کی جانب متحرک ہوتا ہے اور جملہ
(افلاک) کو حرکت دیتا ہے، لہذا چاہئے
کہ وہ سب کو محیط ہو اور محدد جہات ہو،
نیز اپنی سریع حرکت سے زمانہ کا حافظ ہو
اور آٹھ افلاک مغرب سے مشرق کی طرف
گردش کرتے ہیں۔

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

غرض افلاک کلیہ کی تعداد جمہور فلاسفہ و منجمین کے نزدیک نو[9] ہے۔ لیکن مسلمان ماہرین علم الہیئت و فلکیات میں ایسی شخصیتوں کی کمی نہیں تھی جو اپنے یونانی پیشرووں کی آنکھ بند کرکے تقلید کرنا نہیں چاہتے تھے انھوں نے کہا کہ ہیئتی حسابات (Astronomical calculations) کے لئے نویں آسمان کے فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ افلاک نہگانہ کے نظریات پر کوئی ناقابل تردید حسی دلیل تو قائم ہے نہیں، صرف حرکات تسعہ کے تخالف کی بنا پر یہ نظریہ وضع کیا گیا تھا، لیکن حرکات تسعہ کے تخالف کی توجیہ

Marfat.com

اس نظریہ کے علاوہ اور مفروضات سے بھی ہو سکتی ہے، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں بنو موسیٰ نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور نویں آسمان کے وجود سے انکار کیا۔ ابن القفطی نے ان کی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے جس کا عنوان

"کتاب فی انکار ان ثم کرۃ تاسعۃ الافلاک"[1]

ہے۔ اس کتاب کے اندر انھوں نے اپنے اختلاف کی توجیہ طبیعیاتی و مابعد الطبیعیاتی اصولوں پر نہیں کی، بلکہ ریاضی و ہندسہ کی مدد سے اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ابن الندیم اسی کتاب کا نام وضاحت کے ساتھ:

کتاب بین فیہ بطریق تعلیمی و مذہب ہندسی انہ لیس فی خارج کرۃ الکواکب الثابتۃ کرۃ تاسعۃ"[2]

بتاتا ہے یعنی فلک البروج یا فلک الثوابت (آٹھویں آسمان) کے اوپر نواں آسمان نہیں ہے، اس کا ثبوت بذریعہ ریاضی و ہندسہ۔

---

[1] ابن القفطی تاریخ الحکماء ص ۳۱۶ [2] ابن الندیم کتاب الفہرست ص ۳۷۹،

(معارف: نومبر ۱۹۷۳ء)

Marfat.com

۴

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں محقق طوسی نے اس نظریہ کی تجدید کی اور افلاک ثمانیہ کی تجویز پیش کی، چنانچہ محقق کی کتاب "تجرید الکلام" کے شارح جدید ملا علی قوشجی نے لکھا ہے:-

"وجوّز المصنف ان یکون الافلاک ثمانیة بان یستند الحرکة الیومیة الی مجموعها لا الی فلک خاص وذلک بان یتعلق بها نفس تحرکها"
(شرح تجرید برحاشیہ شرح مواقف جلد ثانی صفحہ ۳۱۳)

مصنف نے تجویز پیش کی تھی کہ آسمان آٹھ مان لئے جائیں، اس طور کہ حرکت یومیہ کو ان سب کے مجموعہ کی طرف منسوب کیا جائے نہ کہ کسی خاص مستقل فلک کی طرف، اور وہ اس طور پر کہ خود اس کا تحرک اس سے متعلق ہو۔

محقق طوسی کے شاگرد رشید علامہ قطب الدین شیرازی نے اس آٹھ کو مزید کم کر کے سات کی تجویز پیش کی، چنانچہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "تحفہ شاہیہ" میں لکھا ہے:

"جب میں نے مصنف سے یہ تجویز سنی تو میں نے کہا تب تو سات آسمان بھی ہو سکتے ہیں بایں طور کہ ثوابت اور دوائر بروج کو فلک زحل (ساتویں آسمان) کے محدب پر فرض کریں اور سات

Marfat.com

آسمانوں کے مجموعے کے ساتھ یہ قوت محرکہ متعلق ہو جو اسے حرکتِ اولیٰ کے ساتھ گردش دیتی ہو اور ایک اور قوت محرکہ ساتویں آسمان کے ساتھ متعلق ہو جو دوسری حرکت کے ساتھ اسے گردش دیتی ہو لیکن شرط یہ ہے کہ دوائر بروج حرکت سریعہ کے ساتھ (نہ کہ حرکتِ بطیئہ کے ساتھ) حرکت کرتے ہوئے فرض کئے جائیں تاکہ اُن میں ثوابت ایک برج سے دوسرے برج میں منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ واقع میں ہوتا ہے۔"

(قطب شیرازی فرماتے ہیں کہ محقق نے اس تجویز کو بہت زیادہ پسند کیا ہے اور بڑی تعریف کی۔" (شرح تجرید صفحہ ۲۱۳ ، ۲۱۴)

نویں صدی کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے بحر افلاک ثمانیہ کی تجویز کا اعادہ کیا:-

"ولکن ان یقال حرکة تلک الافلاک الی مجموع الثمانیة من حیث ہو مجموع بان یتعلق بہا نفس واحدة تحرکہا بہذا الحرکة فحینئذ لا حاجة الی التاسع۔" (شرح چغمینی ص ۲۲)

(اور ممکن ہے کہ تلک الافلاک کی (مزعومہ) حرکت کو (باقی) آٹھ آسمانوں کے مجموعہ کی طرف منسوب کیا جائے بایں طور کہ اس سے ایک نفس متعلق ہو جو اسے اس حرکت کے ساتھ گردش دیتا ہو، اس وقت نویں آسمان کی حاجت نہیں رہتی۔

متاخرین میں امام الدین ریاضی قطب شیرازی کی تجویز کا امتحان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

"والاکتفاء بالسبع بفرض الکواکب فی ممثل زحل والدوائر البروج علی محدب ممثلہ علی ما ذکرہ العلامة فی التحفة ممکن۔" (التصریح صفحہ ۶)

اور سات آسمانوں پر اکتفا کرنا بھی ممکن ہے جیسا کہ علامہ قطب الدین شیرازی نے تحفۂ شاہیہ میں ذکر کیا ہے، بایں طور کہ کواکب ثابتہ کو زحل کے ممثل میں فرض کیا جائے اور دوائر البروج کو اس کے ممثل کی سطح محدب پر۔

Marfat.com

لیکن اسلامی علم الہیئت کی اس دیرینہ روش کے برخلاف جو بنو موسیٰ (تیسری صدی ہجری کا وسط) کے زمانے سے لے کر اہلم الدین، ریاضی (بارہویں صدی ہجری کا آغاز) کے عہد تک "تقلیل تعداد افلاک" کی تجویز پر مصر رہی تھی، فاضل جونپوری نے "تکثیر تعداد افلاک" کے احتمال پر زور دیا۔ شاید جمہور ماہرین علم الہیئت کی اس سنت دیرینہ کے خلاف انحراف کی تہہ میں مابعد الطبیعیاتی فلسفہ کے قدیم میلانات غیر شعوری طور پر کارفرما رہے ہوں، جو کثرت عقول کے درپے اثبات تھے، ہر فلک کے ساتھ ایک "عقل" وابستہ ہے، لہٰذا جتنی "عقول" ہونگی، ان سے ایک کم تعداد افلاک کلیہ کی ہوگی اور جتنے افلاک ہونگے، ان سے ایک زیادہ تعداد "عقول" کی ہوگی،

مگر کواکب سیارہ کے افلاک کلیہ میں تکثیر کی گنجائش نہیں تھی، ہر سیارہ ایک فلک میں جڑا ہوا ہے، فلک اطلس میں بھی کوئی تکثیر کی گنجائش نہیں ہے، وہ منفرد اور بسیط ہے، اگر گنجائش ہے تو فلک البروج (فلک ثامن) میں ہے، ہو سکتا ہے کہ کواکب ثابتہ میں سے ہر ستارا ایک مستقل فلک میں مرکوز ہو اور چونکہ ثوابت مرصودہ کی تعداد ایک ہزار بائیس یا ایک ہزار پچیس ہے، اس لئے افلاک کلیہ کی تعداد ایک ہزار تیس یا اس سے زائد ہو سکتی ہے، یا کئی کئی کواکب ثابتہ ایک آسمان میں جڑے ہوئے ہوں، اس طرح بھی ان کی تعداد میں معتد بہ کثرت کا احتمال ہے،

بہرحال ملا محمود جونپوری نے تعداد افلاک میں تقلیل کی کوشش کی رسم دیرینہ کے علی الرغم اس میں تکثیر کے احتمال کو اجاگر کیا اور فرمایا،

"والاکتفاء بفلک واحد للثوابت انما ہو قناعۃ منہم علی ما لابد منہ فی انتظام الامور احجام عن اثبات الفضل الا جزم بنفی الکثرۃ فیحتمل ان یکون للثوابت عدۃ	کواکب ثابتہ کے لئے ایک ہی فلک پر اکتفا کرنا، یہ صرف حکماء سابقین کی (فلک واحد پر) قناعت کرنے کی بنا پر تھا جو کائنات کی حسن نظم نیز زیادتی سے بچنے کے لئے ناگزیر تھا۔

افلاک اما بازاء کل کوکب فلک او دون ذلک.

اس کی وجہ فلک ثوابت میں کثرت افلاک نہ ہونے کے یقین پر مبنی نہیں تھی، پس اس بات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ فلک ثوابت کے اندر بھی متعدد اور کثیر تعداد میں افلاک ہوں خواہ ہر ستارے کے لئے ایک مستقل فلک یا اس سے کم تعداد میں

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۲)

دوسرا مسئلہ "ترتیب افلاک" کا تھا۔ اس سلسلے میں قاضی زادہ رومی نے فرمایا تھا:-

"واما ترتیبہا علی الوجہ المذکور فلان المحرک للکل ینبغی ان یکون محیطاً بہ و ...... وان بعض الثوابت منکسف بزحل المنکسف بالمشتری المنکسف بالمریخ المنکسف بالزہرۃ المنکسفۃ بعطارد والقمر کاسف للشمس۔ ولاشک ان فلک المنکسف فوق فلک الکاسف"

رہی ان کی ترتیب سابق میں مذکور انداز پر تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسم فلکی جو جملہ افلاک کا محرک ہے اس کے مناسب حال یہی بات ہے کہ وہ سب پر محیط بھی ہو.... اور چونکہ بعض کواکب ستارہ زحل سے گہنا جاتے ہیں، زحل مشتری سے گہنا جاتا ہے، مشتری میں ستارہ مریخ سے گہن آجاتا ہے، مریخ ستارہ زہرہ سے منکسف ہو جاتا ہے اور چاند سورج کا کاسف ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ایک فلک کا جڑا ہوا ستارہ دوسرے فلک میں جڑے ہوئے ستارہ کا کاسف ہو تو جس

Marfat.com

فلک کا ستارہ گھنایا ہے وہ گھنانے والے

ستارے کے فلک کے اوپر ہوگا۔ (شرح چغمینی صفحہ ۲۱۲)

لیکن یہ اصول آفتاب کی وضع متعین کرنے میں معاون نہیں ہوسکتا کہ آیا وہ فلک مریخ کے نیچے اور زہرہ سے اوپر ہے یا نہیں، کیونکہ آفتاب کا ان دونوں ستاروں کے ساتھ اقتران ہوتا ہے تو وہ اس کی تیز اشعہ کے تحت مضمحل ہوجاتے ہیں، لہذا ماہرین نے اس کے تیقن کے لئے دوسر اختیارات وضع کئے، یہ نیا طریقہ "اختلاف المنظر" کا تھا، کیونکہ مریخ کا "اختلاف منظر" نہیں ہوتا، اس لئے ثابت ہوا کہ وہ آفتاب سے اوپر ہے،

مگر آفتاب کا عطارد و زہرہ سے اوپر ہونا اس طریقہ "اختلاف المنظر" سے متعین نہیں ہوسکتا. کیونکہ اختلاف منظر "آلہ ذات الشعبتین" کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے، مگر جب یہ دونوں ستارے (عطارد و زہرہ) آلہ ذات الشعبتین کے قریب پہونچتے ہیں تو عام طور پر مرئی نہیں رہتے، اس لئے یہاں طریقہ "اختلاف المنظر" ناکام ہوجاتا ہے،

اس لئے مزید تحقیق "ابعاد و اجرام" کے اصولوں کی مدد سے کی گئی، ظاہر ہے جو جرم فلکی ہمارے قریب ہوگا، اس ستارے سے نیچے ہوگا جو ہم سے دور ہے، چونکہ آفتاب کا بعد زہرہ کے بعد سے اور موخر الذکر کا بعد عطارد کے بعد سے زیادہ ہے، اس لئے زہرہ آفتاب کے نیچے اور عطارد زہرہ کے نیچے ہوگا،

بہرحال قدماء (جن میں بطلیموس صاحب المجسطی خصوصیت سے قابل ذکر ہے) آفتاب کے عطارد و زہرہ سے اوپر ہونے کے قائل تھے، اگرچہ اس قائل ہونے میں تحقیق سے زیادہ خوش فہمی کی کارفرمائی تھی، کیونکہ آفتاب نیر اعظم ہے اس لئے یہ بار کے شمسہ (واسطۃ العقد) کی طرح نظام سیارات کے وسط میں ہونا چاہئے، تین سیارے قمر، عطارد اور زہرہ اس کے نیچے

Marfat.com

اور تین سیارے مریخ، مشتری، اور زحل، اس کے اوپر لیکن بطلیموس نے علم الابعاد والاجرام کی مدد سے بھی اس کی تصدیق کر لی تھی،

متاخرین بھی اسی نظریے کے قائل تھے، چنانچہ قاضی زادہ رومی نے لکھا ہے:۔

"فذہب بعض القدماء الی انہا فوقہا استحسانا لتوسط الشمس بین السیارات بمنزلۃ شمسۃ القلادۃ ..... والیہ مال صاحب المجسطی وتأکد ہذا الرأی عندہ لما رای بعد الشمس المعلوم بطریقۃ معلومۃ فی الابعاد والاجرام مناسبا لہذا وعلیہ جمہور المتاخرین"

چند قدیم ماہرین علم الہیئت اس جانب گئے کہ وہ (آفتاب) ان دونوں (زہرہ وعطارد) سے اوپر ہے اس کی وجہ ان ماہرین کا آفتاب کو سیاروں کے بیچ بیچ میں فرض کرنا تھا جیسے ہار کے اندر واسطۃ العقد بیچ میں ہوتا ہے ..... اور اسی جانب (بطلیموس) مصنف کتاب المجسطی کا میلان ہے، بعد میں جب اس نے علم الابعاد والاجرام میں مذکورہ طریقوں سے آفتاب کی (اور اسی طرح زہرہ وعطارد کی) دوریاں دریافت کیں تو اس رائے کی مزید تائید حاصل ہو گئی۔ اور اسی ترتیب کے جمہور متاخرین ماہرین علم الہیئت قائل ہیں۔

(شرح چغمینی صفحہ ۲۱۳)

اس "نظریۂ مُوکہ" کی تائید بعض ماہرین علم الہیئت (جن میں شیخ بو علی سینا بھی شامل ہے) کے اس مشاہدہ سے ہوئی کہ انھوں نے زہرہ کا اس طور پر مشاہدہ کیا گویا وہ آفتاب کے چہرے پر تل ہے[1]۔ اور ابن ماجہ اندلسی نے تو حسب روایت صاحب نہایۃ الادراک "یہاں تک لکھا ہے"

[1] شرح چغمینی صفحہ ۲۲۳،

Marfat.com

کہ میں ایک دن اپنے مکان کی چھت پر تھا، میں نے طلوع آفتاب کے وقت اس میں (آفتاب پر) دو تل جیسے پائے، پس میں نے زیچ کی مدد سے زہرہ و عطارد کی تقویموں کا استخراج کیا اور انہیں تقویم آفتاب کے نزدیک پایا، اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ دونوں "تل" زہرہ و عطارد تھے۔ (شرح چغمینی صفحہ ۲۳ حاشیہ ۳)

مگر رصدگاہ مراغہ کے بعض کارکن بقول؎

اے خوردہ گیر بحن رجال ہم رجال | ہم اگلے جانیوالوں کی تقلید کیوں کریں

خود کو اس تقلید جمہور کا گلے میں پٹہ ڈالنے پر راضی نہ کر سکے، چنانچہ صاحب "تحفہ شاہیہ" (قطب الدین شیرازی) اور موید الدین عرضی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آفتاب زہرہ اور عطارد کے درمیان ہے یعنی زہرہ سے نیچے اور عطارد کے اوپر ہی نہیں بلکہ انھوں نے عطارد کی بعید ترین دوری اور آفتاب کی قریب ترین دوری نکال کر یہ معلوم کیا کہ دونوں کے فرق میں سیارہ زہرہ کی تدویر بھی نہیں سما سکتی، اس کے مثل کا تو کیا مذکور، اس لئے وہ اس حتمی نتیجے پر پہونچے کہ فلک الشمس کا فلک زہرہ کے اوپر ہونا ناممکن ہے[۲]۔

بلکہ بعض قدیم ہیئت داں تو یہاں تک کہتے تھے کہ فلک شمس فلک زہرہ اور فلک عطارد دونوں کے نیچے ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دونوں اس کے کاسف ہوجایا کرتے۔[۳]

غالباً یہ سب قیل وقال اور مختلف کواکب کی باہمی فوقیت اور تحتیت دریافت کرنے کے گوناگوں طریقے فاضل جونپوری کے پیش نظر تھے مگر چونکہ فلسفہ کی کتاب میں ان جزئی تفصیلات کی گنجائش نہیں تھی، اس لئے انھوں نے "خیر الکلام ما قل و دل" کے مصداق اس پر حسب ذیل مبصرانہ تبصرہ فرمایا:۔

---

[۱] شرح چغمینی صفحہ ۲۳، [۲] ایضاً ص ۲۳ حاشیہ ۱۱، [۳] ایضاً ص ۲۳

و توسلوا الی معرفۃ نضدہا و ترتیبہا الجی کسف بعضہا بعضاً و عدم اختلاف المنظر فی بعض و وجودہ قلۃ او کثرۃ فی بعض آخر الی غیر ذلک من الوجوہ

اور ماہرین علم الہیئت کی سیارات سبع کی اس تنظیم و ترتیب کی معرفت کی جانب اس بات کے ذریعہ رسائی ہوئی کہ بعض سیارے دوسرے سیاروں کے کاسف ہوتے ہیں، بعض میں اختلاف المنظر بالکل نہیں ہوتا بعض میں ہوتا ہے کسی میں کم کسی میں بہت زیادہ، اور اسی طرح کے دوسرے طریقے،

(شمس بازغہ ص ۱۴۳)

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر وہ رصدگاہ تعمیر کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو نہ صرف ان مروجہ طریقوں ہی کی تائید؛ اصلاح کرتے بلکہ شاید اس مسئلۂ لاینحل کی گتھی سلجھانے کے لئے کچھ نئے طریقوں کا بھی اختراع فرماتے،

مگر افلاک کلیہ کی تعداد سے زیادہ پیچیدہ اور لاینحل افلاک جزئیہ" کی تعداد کا مسئلہ تھا، اس کی تفصیل یہ ہے:۔

علم الہیئت کا آغاز یونان میں ہوا، اس کا مقصد اجرام سماوی کی سیر و گردش کو منضبط کرنا تھا، سائنٹفک بنیادوں پر اس کی ابتدا افلاطون نے کی، اس نے ہیئت دانوں کے سامنے سیاروں کی گردش کو قابلِ تعدیل متشابہ حرکات دوریہ کے مفروضہ کے ذریعہ منضبط کرنے کا مسئلہ رکھا، اس کے شاگرد ایوڈوکس (Eudoxus) نے ہر سیارہ کی حرکات کا انضباط افلاکِ جزئیہ کی حرکاتِ دوریہ کے مجموعی نتیجے (Resultant) کی مدد سے کرنے کی کوشش کی، اس کے مجوزہ نظام میں افلاکِ جزئیہ کی تعداد چھبیس[۲۶] تھی اس کے

بعد ایک دوسرے یونانی ہیئت دان کالپس (Callippus) نے جب اس طرح کی منضبط حرکات کو واقعی حرکات سے مختلف پایا تو ان افلاک جزئیہ کی تعداد میں مزید اضافہ کیا اور اس طرح اس کے یہاں ان افلاک جزئیہ کی تعداد تینتیس[33] ہو گئی۔ ارسطو نے بھی اصولاً اسی مفروضہ کو اپنایا، صرف افلاک جزئیہ کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ اسکے یہاں یہ تعداد بڑھ کر پچپن[55] ہو جاتی ہے۔ بعد کے ماہرین فلکیات نے بھی اسی مفروضہ کو معمول بہ بنایا۔

البتہ اپلونیوس (Apollonius) نے "ہم مرکز کروں" (Concentric spheres) کے نظریہ کے بجائے "خوارج" (Eccentrics) اور "تداویر" (Epicycles) کے نظریہ کے ذریعہ سیاروں کی حرکات منضبط کرنے کا اصول پیش کیا، اس طرح افلاک جزئیہ کی تعداد خاصی کم ہو گئی،

بہرحال اپلونیوس کے پیش کردہ اصول کو ابرخس (Hipparchus، زمانہ دوسری صدی قبل مسیح) نے آفتاب و ماہتاب کی حرکات منضبط کرنے میں استعمال کیا، اس کے تین سو سال بعد بطلیموس نے اس اصول کو جملہ سیاروں کے باب میں استعمال کیا اور اس طرح اس نظام ہیئت کو سرحد تکمیل تک پہونچایا جو اس کے نام پر "بطلیموسی نظام ہیئت" کہلاتا ہے، اس کا شاہکار "کتاب المجسطی" ہے۔

عہد اسلام میں بھی یہی نظام ہیئت مسلمان ہیئت دانوں میں مروج رہا۔ دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں "المجسطی" کا باقاعدہ طور پر سرکاری سرپرستی میں عربی کے اندر ترجمہ ہوا[1] اور وہ اس فن کی معیاری اور معتمد علیہ کتاب سمجھی جانے لگی، کچھ معمولی تعدیلات کے ساتھ بعد کے مسلمان ماہرین علم الہیئت نے اسی نظام ہیئت کے اصولوں کا اتباع کیا۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۲۷۴،

ساتویں صدی ہجری کے وسط تک افلاک جزئیہ کی تعداد چوبیس[۲۴] سمجھی جاتی تھی۔ محقق طوسی نے "تجرید الکلام" اور "التذکرہ فی الہیئت" کے اندر یہی تعداد بتائی ہے، چنانچہ وہ "تجرید الکلام" میں لکھتے ہیں:۔

۔ الفصل الثانی فی الاجسام: وہی قسمان فلکیۃ وعنصریۃ، اما الفلکیۃ فالکلیہ منہا تسعۃ واحد منہا غیر مکوکب محیط بالجمع وتحتہ فلک الثوابت، ثم افلاک الکواکب السیارۃ السبعۃ علی الترتیب وتشتمل علی افلاک تداویر وخارجۃ المراکز المجموع اربعۃ وعشرون۔

فصل ثانی درباب اجسام: اجسام کی دو قسمیں ہیں، اجرام فلکیہ اور اجسام عنصریہ، جہاں تک اجرام فلکیہ کا تعلق ہے تو ان میں افلاک کلیہ کی تعداد نو ہے جن میں سے ایک بغیر سیاروں کا ہے جو تمام افلاک وعناصر پر محیط ہے۔ اس کے نیچے فلک ثوابت ہے، پھر سیارات سبعہ کے افلاک ہیں ترتیب مشہور کے مطابق، اور ان افلاک میں ہر فلک افلاک جزئیہ یعنی تداویر اور خارج المراکز پر مشتمل ہے اور ان سب کی مجموعی تعداد چوبیس[۲۴] ہے۔

(شرح تجرید ج ۲ ص ۲۱۳، ۲۱۷)

لیکن "تجرید الکلام" کے شارح علامہ قوشجی کے یہاں یہ تعداد پچیس[۲۵] ہے، چنانچہ وہ شرح تجرید جدید میں فرماتے ہیں:۔

۔ فعدد الافلاک الجزئیۃ تصیر ستۃ عشر ای مع الافلاک الکلیۃ التسعۃ ترتقی الی خمس وعشرین علی ما ذکرنا۔

پس افلاک جزئیہ کی تعداد سولہ[۱۶] ہو جاتی ہے اور وہ نو افلاک کلیہ کے ساتھ مل کر پچیس[۲۵] تک پہونچ جاتے ہیں جیسا کہ

(شرح تجرید جلد ثانی ص ـــ ۱۸۱) ہم ذکر کر چکے ہیں،

بعد میں متاخرین نے اس تعداد میں مزید اضافے کئے ہیں چنانچہ علامہ خضری کے یہاں یہ تعداد پچاسی تک پہونچ گئی ہے، اسی کی طرف فاضل جونپوری نے شمس بازغہ میں اشارہ کیا تھا،

"وقد زاد المتاخرون لذلک افلاکا واختلفوا فی تصویرھا من اراد الوقوف علیہ فلیرجع الی شروح التذکرہ"

(شمس بازغہ ص ۱۴۲)

اسی وجہ سے متاخرین علمائے علم الہیئت نے افلاک (جزئیہ) کی تعداد میں اضافے کئے اور ان کی صورت کشی میں اختلاف کیا جو اس (کی تفصیل) پر واقف ہونا چاہئے، اسے (محقق طوسی کی کتاب "التذکرۃ فی الہیئۃ" کی شرح سے رجوع کرنا چاہئے،

معلوم نہیں اور مصنفوں نے ان افلاک جزئیہ کے تعدد و تکثر کی کوئی توجیہ کی ہے یا نہیں، علم الہیئت کی متداول کتابوں میں تو صرف ان کی ساخت اور صورت کو محض ادعائی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جسکا ماحصل یہ ہے کہ جملہ افلاک جزئیہ کی تعداد بشمول فلک الثوابت چوبیس ۲۴ ہے بتفصیل ذیل

۱.	فلک اطلس	۱	۶.	فلک شمس	۲ ممثل، خارج المرکز
۲.	فلک الثوابت	۱	۷.	فلک زہرہ	۳ ممثل، حامل، تدویر
۳.	فلک زحل	۳ ممثل، حامل، تدویر	۸.	فلک عطارد	۴ ممثل، مدیر، حامل، تدویر
۴.	فلک مشتری	۳ ممثل، حامل، تدویر	۹.	فلک قمر	۴ جوزہر، مائل، حامل، تدویر
۵.	فلک مریخ	۳ ممثل، حامل، تدویر		جملہ	۲۴

Marfat.com

بہر حال شارح چغمینی ہوں یا مصنف "تشریح الافلاک" افلاک جزئیہ کے پیچیدہ نظام کی توجیہ کسی نے نہیں کی، اس کوتاہی کو فاضل جونپوری نے پورا کیا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

وہم لما لاحظوا احوال السیارات فوجدوا فی حرکۃ کل منہا اختلافا بالسرعۃ تارۃ والبطوء اخری، وفی المتحیرۃ منہا مع ذلک اختلافا بالاستقامۃ والرجعۃ والمعطیات من الاصول تدفع ان تکون فی حرکات لافلاک البسیطۃ اختلاف بالاشتداد والانتقاص فی السرعۃ والبطوء کما یکون فی الحرکات الطبیعیۃ والقسریۃ علی ما علمت ولا وقوف کما یکون فی الطبیعۃ ببلوغ المکان الطبیعی او قسر قاسر وفی القسریۃ بانتہاء القوۃ القاسرۃ وغیرہ ذلک او انعطاف کما یکون من قسریۃ الی طبیعیۃ او نحو ذلک، فان تلک الاجرام متعالیۃ عن ان یتطرق الیہا تفاوت احوال الا ما یقتضیہ بسائط حرکاتہا الدوریۃ المستمرۃ علی نہج واحد، لاجرم اثبتوا لکل افلاکا علی مراکز مخصوصۃ تتحرک بحرکات متقدرۃ

جب علماء ہیئت نے سیارات کے حال کا ملاحظہ کیا تو ان میں سے ہر ایک کی حرکت میں اختلافات پائے کہ کبھی یہ حرکت سریع ہو جاتی ہے اور کبھی بطی (ان سیارات سبع میں سے خصوصیت کیساتھ) متحیرہ، میں ان کی استقامت اور رجعت کے بھی اختلافات پائے، حالانکہ اصول و مبادی (علم حکمت) کے ضابطے یہ ماننے کے مخالف ہیں کہ افلاک بسیطہ کی حرکتوں میں سرعت اور بطو کے اندر شدت اور کمی کے اختلافات ہوں، جیسا کہ حرکت طبیعیہ اور حرکت قسریہ میں ہوا کرتا ہے جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے، اور نہ ہی ان اجرام فلکیہ کی حرکتوں میں (واقعی) سکون و وقوف اور ٹھہراؤ ہی ممکن ہو سکتا ہے جیسا کہ حرکت طبیعی میں ہوا کرتا ہے (کہ جسم متحرک، اپنے مکان طبیعی میں پہونچکر

Marfat.com

على مناطق و اقطاب معينة، بحيث لا يكون
في شيءٍ من الحركات البسيطة اختلاف و
يلتئم من عدة عدة متعلقة بكوكب كوكب
ما ينتظم به حالات ذلك الكوكب، ويلزم
بالعرض اختلافاتها على ما يتكفل بتفصيله
مفصلة صناعة المجسطي !!

ساکن ہو جاتا ہے یا قسر قاسر سے وہ ٹھہر جاتا
ہے یا جس طرح حرکت قسریہ میں ہوا کرتا
ہے کہ جب قوت قاسر ختم ہو جاتی ہے،
(تو جسم ساکن ہو کر ٹھہر جاتا ہے) اور نہ
(افلاک بسیط کی حرکات بسیط میں انعطاف
(مڑنا) ہی ہوا کرتا ہے جیسا کہ حرکت قسریہ
سے حرکت طبیعیہ میں منتقل ہونے وقت
ہوتا ہے، یا اس طرح کے دوسرے امور،
کیونکہ ان اجرام فلکی کا مرتبہ اس سے کہیں
بلند ہے کہ ان کے اندر تفاوت حال راہ
پا سکے سوائے اس کے جو ان حرکات دوریہ
کے بسائط کا مقتضا ہو ایسی حرکات دوریہ
جو امور زمان کے باوجود ہمیشہ ایک ہی
نہج پر مستمر رہتی ہیں مجبوراً ہر سیارے
کی گردش کے لئے بہت سے افلاک جزئیہ
ثابت کرنے پڑے جو مخصوص مراکز کے گرد
مختلف المقادیر حرکتوں کے ساتھ مخصوص
ومتعین مناطق اور اقطاب پر گردش
کرتے ہیں، اس طرح کہ ان کی حرکات

Marfat.com

بسیطہ میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو، اور ہر ہر ستارے کے مختلف افلاک جزئیہ کی حرکات کے مجموعی نتیجے سے اس ستارے کے مختلف حالات منتظم ہوتے ہیں، اسی طرح بالعرض ان کے اختلافات لازم آتے ہیں جن کی مفصل توضیح و تفصیل کے لئے کتاب المجسطی یا (اس میں مذکور) علم الہیئت کے ضوابط و قواعد متکفل ہیں (لہذا ان سے رجوع کیا جائے

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اس کے بعد نہایت ہی ناقدانہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ بطلیموس نے جو افلاک جزئیہ کی تعداد ثابت کی ہے اس کے پیش نظر افلاک خارجۃ المراکز کے اوج و حضیض کے سبب سے پیدا ہونے والے اسراع و ابطاء کے اختلاف کا مسئلہ نیز تداویر کے سبب سے پیدا ہونے والے سرعت و بطؤ کے اختلاف اور خمسہ متحیرہ کے اندر اقامہ، رجعت اور استقامہ کے مظاہر کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے مگر ایک مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہو پاتا، اصول یہ طے پایا تھا کہ ہر حرکت دوری میں متحرک کی حرکت کا متشابہ خود اس کے مرکز کے اعتبار سے متحقق ہوگا نہ کہ کسی اور مرکز کے اعتبار سے۔

"لکن لا یخل بہ انہ کیف یتشابہ حرکات مراکز التداویر للمتحیرۃ حول مرکز الثالث المتوھم المسمّی بالمعدل لمسیر وتتم حول مرکز الفلک المائل المنطبق علی مرکز العالم ولم یتشابہ حول مراکز حوامِلِہا کما ھو الظاہر من الاصول" (شمس بازغہ ص ۱۴۲، ۱۴۳)

لیکن اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ کواکب متحیرہ میں ان کی تداویر کے مراکز کیوں ایک موہوم فلک کے مرکز کے گرد حرکت متشابہ کے ساتھ گردش کرتے ہیں جسکا نام معدل المسیر ہے، اسی طرح فلک قمر میں اس کی تدویر کا مرکز کیوں فلک مائل کے مرکز کے گرد جو مرکز عالم پر منطبق ہے، حرکت متشابہ کے ساتھ چکر لگاتا ہے، حالانکہ انھیں اپنے حوامل کے مرکز کے گرد حرکت متشابہ میں گردش کرنا چاہیئے تھا جیسا کہ اصول کا مقتضا تھا۔

غرض یہ مسئلہ بطلیموسی نظام ہیئت میں لاینحل رہا، اگرچہ بعد میں متاخرین نے اس اختلاف (Anomaly) کو حل کرنے کے لئے افلاک جزئیہ کی تعداد میں اضافہ کیا جیسا کہ فاضل خضری نے کیا، اس کی طرف نیز اس باب میں فاضل جونپوری کے مشورہ کی جانب سابق میں اشارہ کیا جا چکا ہے،

"شمس بازغہ" اصولاً فلسفہ کی کتاب ہے جس کا موضوع جمہور مصنفین فلسفہ و حکمت کے یہاں طبیعیات و مابعد الطبیعیات سمجھا جاتا ہے، "شفائے بو علی" کی طرح یہ علوم حکمیہ کی قاموس یا مجموع العلوم (Compendium) نہیں ہے، خود مصنف علیہ الرحمہ نے سے "ماقبل الطبیعیات و مابعد الطبیعیات" کے مباحث کی توضیح کے لئے لکھنا شروع کیا تھا، اگرچہ زندگی نے اتنی وفا نہ کی کہ وہ مابعد الطبیعیات سے تعرض فرماتے، "ماقبل الطبیعیات" (طبیعیات) کے جملہ مباحث کا استقصا بھی نہ کر پائے، ریاضی و ہیئت کے مسائل سے تعرض کہیں کہیں ضرورتہً آگیا ہے، لیکن عبارت کے دروبست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ان علوم (ریاضی و ہیئت) کے اندر اپنے اظہار ہمہ دانی کی نمائش کے لئے ان سے تعرض نہیں کیا تھا۔

مگر جس نہج سے یہ مسائل بیان ہوئے ہیں، ان سے ایک جانب ان علوم کے باب میں ان کی حکیمانہ بصیرت کا اور دوسری جانب ان کے اندر فنکارانہ حذاقت کا ثبوت

Marfat.com

ملتا ہے، مثلاً افلاک کلیہ کی تکثیر اور افلاک جزئیہ کے تعدد کی انھوں نے جو توجیہ و تعلیل کی ہے (اور جس کی نظیر ان علوم کی متداول کتابوں میں نہیں ملتی) وہ ان علوم کے اندر ان کی حکیمانہ بصیرت کی دلیل ہے، اور مختلف افلاک کی ترتیب کے سوال سے جس یکجائی کے ساتھ انھوں نے تعرض کیا ہے، وہ اعمال ارصاد (Observatory Technique) میں ان کی فنکارانہ حذاقت، دستگاہ عالی اور مہارت تامہ کی دلیل ہے یہ شان خود اعتمادی اسی فاضل و ماہر کی پیشکش میں ہو سکتی ہے جس نے مختلف سیاروں کے کشف و انکشاف کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہو جسے آلہ ذات الشعبتین کے استعمال کا محض تجربہ ہی نہ ہو بلکہ جس نے اس کے ذریعہ مختلف سیاروں کے "اختلاف المنظر" (Parallax) کو دریافت کیا ہو اور جس نے متعلقہ آلات رصدیہ کی مدد سے مختلف اجرام فلکی کے ابعاد دریافت کئے ہوں،

ایسے حکیم باجصیرت اور تجربہ کار ماہر فن کو حق پہونچتا تھا کہ اس کی علمی و فنی تجاویز کی انتہائی گرمجوشی سے پذیرائی ہوتی، مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا، بشریت کے تقاضے اور انسانی کمزوریاں علم و حکمت کی ترقی کی راہ میں آڑے آگئے،

علامی سعد اللہ خاں تاریخ کی اہم شخصیت ہیں، انھوں نے شاہجہانی مملکت کے انتظام و استحکام میں جو خدمات شائستہ انجام دیں وہ ہندوستان کی مغلیہ تاریخ کا ایک روشن اور درخشاں باب ہے، لیکن اگر جو کچھ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے صحیح ہے — اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے ان کا اختراع و اختلاق سمجھا جائے — تو علم و حکمت کی تاریخ ان کی اس کمزوری کو کبھی معاف نہ کر سکے گی کہ محض ان کی اس دراندازی کی وجہ سے تاریخ کی ایک عظیم ترین رصدگاہ ظہور میں آتے آتے رہ گئی۔

Marfat.com

بہرحال محمد صالح کنبو کا یہ تبصرہ

"در انواع فنون دانش خصوص .... ریاضی .... ہیچ کس از ارباب استعداد در اقوت دعوی برابری با وے نبود" (عمل صالح جلد اول ص ۳۸۳)

متاخر مغل دور کے ایک ادیب کی عبارت آرائی و مبالغہ فرمائی نہیں ہے، وہ یقیناً ریاضی وہیئت میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے، اور اگر حالات ان کے لئے سازگار مواقع فراہم کرتے تو ہیئت کے اندر بھی اسی پایہ کی زیج "ظہور میں آجاتی جس پایہ کی کتاب فلسفہ میں "شمس بازغہ" ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی تفسیر میں ملا صاحب کو یدطولیٰ حاصل تھا، اس کی تصدیق امام الدین ریاضی کی تصریح سے بھی ہوتی ہے، جس کی جانب سابق میں اشارہ کیا جا چکا ہے، لیکن محمد صالح کنبو کی عبارت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ انھیں آیات قرآنی سے عجیب و غریب نکات پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا اور یہ نکتہ آفرینی کسی "تفسیر بالرائے" کی مصداق نہیں تھی، بلکہ معاصر علماء بھی اس کی توثیق و تصویب فرماتے تھے، محمد صالح کنبو نے لکھا ہے:-

"قلم فیض رقمش در حالت تحریر تفسیر آیات کلام الٰہی و تعبیر حقائق اشیا کماہی بعنوان تصنع و تفنن بکار می برد و کرہ بر نقش گلکش دعوی فضیلت معنی پرداز می آلی جناب راز بان می دہد و تمکنات او جنبدش بعلاقہ غرائب معنی در صدر انجمن اولیائے والا نظرتان اقامت انداز گشتہ" (عمل صالح جلد اول ص ۳۸۲)

۳۔ البتہ اس سے ایک نیا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ ان کی قوت تقریر اور طلاقت لسانی اس درجہ کی نہ تھی جس درجہ کی ان کی قوت تحریر تھی، محمد صالح لکھتے ہیں:-

"اگر چہ در خور دانش و بینش خود طلاقت زبان و تقریر لسان نداشت

Marfat.com

اما قلم ضعیف رقمش در حالت تحریر...... بعنوان تصنع وتفنن بکاری برد
کہ بر نقش گلکش دعوی افضلیت مبنی بر دانی آں جناب دا زبان می دہد۔"
(عمل صالح جلد اول ص ۳۸۴)

یہ بات قابل غور ہے کیونکہ امام الدین ریاضی نے "باغستان" میں لکھا ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے علم وفضل کے ساتھ ان کی طلاقت لسان اور فن مناظرہ کے آداب میں ان کی مہارت تامہ کے معترف تھے، حالانکہ وہ (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی) خود وقت کے مانے ہوئے فاضل اور آداب مناظرہ کے ماہر تھے، انھوں نے بڑے بڑے فضلائے وقت کو مناظرہ میں ہرایا تھا، ملا شفیعا الملقب بدانشمند خاں کے ساتھ ان کے مناظرے کا حال سابق میں مذکور ہو چکا ہے کہ کس طرح ایک جید عالم کے مقابلہ میں ان کی برتری دربار شاہجہانی میں تسلیم کی گئی۔ بقول امام الدین ریاضی:۔

"بالآخر درستی قول مولوی (عبدالحکیم) وراستی سخن ایشاں بر بادشاہ وسائر امراء وعلماء عالی شان درحضور انجامید" (تذکرہ باغستان: ورق ۷۸ الف)

انھوں نے شیخ عبدالوہاب گجراتی قاضی القضاۃ کو ایک مناظرہ میں ڈانٹ دیا تھا جیساکہ امام الدین ریاضی نے دوسری جگہ لکھا ہے:۔

"مولانائے مذکور را با قاضی القضاۃ فضائل مآب شیخ عبدالوہاب گجراتی مناظرہ واقع شد، درا ثنائے گفتگو از زبان قاضی برزد کہ مرد آدمی سخن آہستہ آہستہ بگو، بگفت تو مرد آدمی، مرد آدمی درچنیں مقام احمق را می گویند، سخن را فہمیدہ بگو،

گوشت خر بفروش ودیگر گوشت خر — ایں سخن را دانیاید گوشت خر

مگر انھیں ملا عبدالحکیم کا جب فاضل جونپوری سے مناظرہ ہوا تو اختتام مناظرہ کے بعد نہ صرف

Marfat.com

حریف کی علمیت کا بلکہ ان کی طلاقت لسان اور فن مناظرہ کے آداب میں ان کے تبحر کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے اور فرمایا

"مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصہ معقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگران در پیش او بمصداق وان اوہن البیوت لبیت العنکبوت سست تر از نسیج عنکبوت است" (تذکرہ باغستان ورق ۶۸۵ الف)

بہرحال محمد صالح ان کی قوت تحریر کے مداح ہیں اور بجا طور پر مداح ہیں۔ ان کے سلیقۂ نگارش کی ایک قابل صد ہزار تعریف مثال ان کا وہ انداز بیان ہے جس کے ساتھ انھوں نے میر باقر داماد سے نظریۂ حدوث دہری میں اختلاف کیا ہے۔ پہلے تو انھوں نے اپنے موقف کی مناسب طور پر ترجمانی فرمائی ہے، پھر میر باقر داماد کے مخترعہ نظریہ حدوث دہری کو بیان کرکے اس پر تنقید کی ہے، مگر انداز انتہائی سنجیدہ اور شریفانہ ہے۔

مگر فاضل جونپوری نے میر باقر داماد کے نظریۂ حدوث دہری کو اپنے لفظوں میں بیان کرنے سے پہلے حریف کی عظمت فکر کی مدح سرائی کی ہے، ازاں بعد ان کے اس اختراع و بدعت طرازی کی بڑے اچھے انداز میں توجیہہ کی ہے، اگر اس کی تفصیل سے بیشتر بمصداق "تتبین الاشیاء باضدادہا" خود میر باقر داماد کے انداز شاباز۔ بال تاب" پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا کہ وہ کس طرح علمی اختلاف سے یکایک شعلہ زیر پا ہو کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ جب متکلمین نے فلاسفہ کے اس موقف پر کہ زمانہ قدیم ہے یہ اعتراض کیا کہ "کان و یکون" کا مفہوم جس طرح ممکنات و مادیات میں جاری ہوتا ہے اسی طرح واجب تعالیٰ اور مجردات میں جاری ہوتا ہے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے فلاسفہ نے "سرمد" دہر اور زمان کی تدقیق کی۔ اس پر امام رازی نے یہ تبصرہ کیا کہ :

"التحویل خال عن التحصیل"

ہے، اتنی سی بات پر میر باقر داماد آپے سے باہر ہو گئے اور "افق المبین" میں فرمایا:۔

"وہم و تزییف: اسمعت مشیر فتنة التشکیک یقلد ضعفاء العقل و یقول زدا علی الفلاسفة ان ھذا التحویل خال عن التحصیل.....

ولیس نسخ فطنة ان ینفطن......

[ایک وہم اور اس کی تردید: کیا تم نے فتنۂ تشکیک کے مشیر کی بات سنی جو ضعیف العقل لوگوں کی تقلید کرتا ہے اور فلاسفہ کی تردید میں کہتا ہے کہ یہ سرمد، دہر اور زمان کی تدقیق بے سود و لایعنی ہے، کیا اس کی عقل میں یہ بات نہیں سماتی کہ......]

گرمیؔ تنا بڑا القاب کرنے والا دوسروں کو فتنۂ تشکیک کا ترجمان اور کم عقلوں کا مقلد بتانے والا جب "حدوث دہری" کا نظریہ پیش کرتا ہے تو لاکھ وہ ہر چند کہ اس نظریہ کی اصابت سے منکر ہیں اور اسے ایک لایعنی ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں سمجھتے مگر اس کی تنقید و تردید میں اطالت لسان کے کرشمے نہیں دکھاتے۔ بلکہ پہلے تو حریف کی عظمت فکر کی مدح سرائی میں اپنے زور فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کی صلاحیتوں کو پورے طور پر صرف کرتے ہیں

بعض خیرة اللاحقین بالمھرة السابقین	(علم حکمت کے) ماہرین سابقین کے بعد جو
مع توغلہ فی سیاحة ارض الحقیقة و توحہ	فضلا ہوئے ان کا بہترین فرد (میر باقر داماد)
سیاحة یم الحکمة و ولوجہ فی اعماق تری	جسے حقائق کائنات کی سیاحت میں توغل
الملک باقدام انظارہ الغایرة و عروجہ	تھا جو حکمت کے سمندر کی تیراکی میں موجوں
عن اطباق سماء الملکوت بقوادم افکارہ الشامخة	کے تھپیڑے کھا کھا کر غوطے لگاتا تھا جو اپنی

غائر نظروں سے ملک کے زیریں حصوں کی

گہرائیوں میں پہونچ جاتا تھا اور جو اپنے بلند

پرواز فکر کے بازوؤں سے سارے ملکوت

کے مختلف طبقوں میں عروج پاتا اور چڑھتا

شمس بازغہ ص ۱۱۰،۱۱۱)   چلا جاتا تھا۔

اس کے بعد ان کی اس نظریہ تراشی کو ایک نیک محمل پر محمول کرنے کے لئے باندازِ شائستہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں وہ اسے ان کے نظریات تراشی کا شوق فضول نہیں بتاتے جیسا کہ عام فلاسفہ میں اپنے حریفوں کے خلاف جذبۂ رشک وحسد کا دستور رہتا ہے (ملا محمود میر باقر داماد کے معاصر متاخر تھے) بلکہ اسے ان کی قومی وملی اور دینی وخاندانی غیرت کا تقاضا بتاتے ہیں کہ انھوں نے یہ جو کچھ کیا محض اپنے قومی وملی عقیدہ کی تائید کے لئے کیا، فرماتے ہیں:۔

"إذ نبض عرق الهاشمي لحماية وذمار الظاهر من الدين والذب عن حمى ما عليه الجمهور من المليين من حدوث العالم بقضيضه وقضيضه لاحدوثاً ذاتياً...... بل حدوثاً أحسن من ذلك مصدقاً لسلب الوجود اصلاً في الاعيان قبل صدق الايجاب ولم يرخصه بصيرة النقادة وقريحة الوقادة ان يقول بالحدوث الزماني للزمان...... ابتدع القول بالحدوث الدهري"

جب ظاہر دین کے پاس (اصول وعقائد) کی حمایت اور حدوث عالم بشمول جملہ مافیہ جس پر جمہور اہل ملت کا اجماع ہے ایسے حدوث کے عقیدے کی حفاظت کے لئے ان کی (میر باقر داماد کی) رگِ ہاشمی پھڑکی ایسا حدوث جو محض (فلاسفہ کا اصطلاحی نام نہاد) حدوث ذاتی نہیں ہے... بلکہ اس سے کہیں زیادہ اچھا اور صحیح حدوث ہے جو اعیان وخارج میں (شے حادث پر)

ایجاب صادق آنے سے پہلے قطعی سلب وجود
کا مصداق ہو، یہ تھی ان میر باقر داماد کی
صلابت ایمانی و دینداری) اور (معہذا)
انکی نقادبصیرت اور ان کے علوم حکمیہ میں
وقاد فکر راسخ (طبع روشن) نے انھیں
زمانہ کے واسطے حدوث زمانی (کا قائل
ہونے) کی بھی اجازت نہیں دی۔....
لہٰذا جمہور فلاسفہ وحکماء کے علی الرغم انھوں
نے حدوث دہری کا نیا نظریہ پیش کیا۔

(شمس بازغہ ص ۱۱۸)

یہ اسلوب بیان نہ صرف سادات کرام کے ایک فرد سے عقیدت کا نتیجہ تھا، جو انھوں نے اپنے نانا سے ورثہ میں پائی تھی، بلکہ ان کے سلیقۂ نگارش کا بھی ایک کرشمہ تھا اور یہ ایک ایسا اسلوب ہے جو کم از کم اس زمانہ میں کبریت احمر کا حکم رکھتا تھا۔

(معارف: دسمبر ۱۹۷۳ء)

اسلامی ہندوستان کی علمی خودداری

الدرۃ الثمینۃ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی

اور

شاہ جہاں اور نواب سعد اللہ خاں

اعتذار :۔ اس عنوان سے معارف (اکتوبر ۱۹۲۳ء) میں جناب حافظ احمد علی خاں شوق ناظر کتب خانہ ریاست رامپور نے رضا لائبریری کے مخطوطہ "الدرۃ الثمینہ" کو متعارف کرایا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کو پینتالیس ۴۵ سال ہو رہے ہیں، اس عرصہ میں نئے مصادر و مراجع منظر عام پر آچکے ہیں جن میں سب سے اہم امام الدین ریاضی (مصنف "التصریح فی الھیئۃ") کا تذکرہ "باغستان" ہے۔

یوں بھی پینتالیس ۴۵ سال کا عرصہ اچھا خاصہ طویل ہوتا ہے، بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ ماضی کی شاندار روایتیں ہمارے لیے بڑی تیزی سے بھولی بسری داستانیں بنتی جا رہی ہیں، اس لیے مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے اکتشافات کی جدید معلومات کے ساتھ تجدید کی جائے۔

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

فاضل مقالہ نگار نے فرمایا تھا :۔

"کتب خانہ ریاست رامپور میں مجموعہ نمبر ۱۳ فن کلام عربی میں یہ مختصر مجلد رسالہ ہے، تقطیع

Marfat.com

کتاب ۱۰ × ۶½ انچ۔ مسطر ۳½ انچ۔ تعداد سطر فی صفحہ ۱۹۔ خط مولویانہ شکست آمیز
صفحات ۲۰ ہیں۔ سنہ ۱۰۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے (۱) اس رسالہ کو شاہجہان بادشاہ کے نام پر معنون
کیا گیا ہے۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اس کے مصنف ہیں۔ آغاز رسالہ یہ ہے: "اللّٰھم باسمک
ابتدئ وبنور تقدیسک اھتدی۔" رسالہ میں علم باری تعالیٰ اور بحث قدم عالم کو نہایت
خوبی سے لکھا ہے (۲) ملا صاحب کا انتقال سنہ ۱۰۶۷ھ یا سنہ ۱۰۶۸ھ میں ہوا ہے۔ اس لیے یہ رسالہ
ان کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے (۳) ملا صاحب کے کمالات اور فضائل سے مدارس عربیہ کا ہر
طالب علم واقف ہو (۴) ان کی شہرت آج نہیں بلکہ ان کی زندگی ہی میں ہندوستان سے
نکل کر عرب و روم میں پہنچ چکی تھی، چنانچہ آجکل ان کی جس قدر کتابیں ہندوستان میں نہیں
چھپی ہیں، اس سے زیادہ ترکی اور قسطنطنیہ میں چھپی ہیں، ہندوستان سے ترکی ان کتابوں
کے پہنچنے کی صورت یہ معلوم ہوئی کہ قدیم زمانہ میں جہاں سلاطین باہم اور تحفہ تحائف اپنے
ملک کی مصنوعات کا بھیجا کرتے تھے، وہاں اپنے دربار کے شعرا کی غزلیں، قصائد، دواوین
اور علماء و فضلاء کی تصنیفات و تالیفات بھی بھیجا کرتے تھے (۵) چنانچہ شاہجہان اور سلطان
محمد خاں سلطان روم کے درمیان اس قسم کے تعلقات قائم تھے، اور اسی طرح شاہی تحائف
کے ضمن میں ہندوستان کے اس مایۂ ناز حکیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات ترکی پہنچی ہیں،
(۶) آج اس سلسلہ میں ہم ملا صاحب کے رسالہ الدرۃ الثمینۃ کا تذکرہ کرتے ہیں، عراقی میں
جان نثار خاں شاہجہاں کی طرف سے کسی خدمت پر مامور تھا (۷) محمد فاروق مشرف الدولہ
محب علی واقعہ نویس اس کے ہمراہ تھے، سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین خلیفہ
سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہو گیا تھا (۸) پھر وہ ہندوستان چلا آیا تھا۔
(۹) شاہجہانی تاریخوں میں اس کا ذکر متعدد مقامات میں ہے (۱۰) یہ ولی اور صاحب علم

Marfat.com

امیر تھا اور "وزیر دانشور عراق" کے نام سے مشہور تھا (۱۱) شاہجہانی سفراء (۱۲) جب عراق گئے تو خلیفہ سلطان سے بھی ملے۔ ان شاہجہانی سفراء کو بھی اپنی جگہ دعوئ فضل و کمال تھا اور اس کو قائم رکھنا گویا ہندوستان اور سلطنت ہند کی عزت وہ سمجھتے تھے۔ (۱۳) وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے (تہافت الفلاسفہ میں) مسئلہ قدم عالم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے سبب سے (۱۴) شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے۔ جان نثار خاں نے شاہجہاں کو اطلاع کی (۱۵) بادشاہ نے اپنے وزیر نواب سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ ملا عبد الحکیم صاحب کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھ کر حاضر کریں کہ عراق کو بھیجا جائے۔ خدا جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی (۱۶) چنانچہ اسی کے پس و پیش زمانہ میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام سے لکھا ہے، سلطان محمد خاں روم نے اپنے دربار کے بڑے فلسفی مولی خواجی (۱۸) سے اس پر محاکمہ لکھوایا ہے جو کتاب الذخیرہ کے نام سے چھپ گئی ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ بہت مہتم بالشان ہے، سینکڑوں کتابیں اس بحث پر لکھی گئی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ شاہان مغلیہ کے الفاظ کو احکام میں بعینہٖ نقل کیا جاتا تھا، شاہجہاں کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اس کو چند جملوں میں ادا کر دیا، سعد اللہ خاں کے خط کو پڑھیے، کہتا ہے کہ کلمات حکماء، تاویلات علماء، وجہ تکفیر اہل اسلام، اقوال ملت، مباحثات، مناظرات، شکوک و شبہات، ازالۂ اعتراضات، سوالات و جوابات غایت تدقیق و نہایت تحقیق سے لکھے جائیں۔ در ہر باب و اساس سخن میں اصل کلام پر گفتگو ہو اور ہر جواب میں براہین ہوں۔ احاطہ مسائل متعلقہ بمطلب علم حصولی و حضوری کے مسائل متعلقہ کے بیان میں پورا احاطہ

کیا جائے اور نیز اس مسئلے کو صاف کیا جائے کہ علم عین عالم ہے یا عین معلوم یا غیر، اور اسکا تعلق جزئیات سے بوجہ کلی ہے یا بوجہ جزئی وغیرہ۔

سعد اللہ خاں کی علمی استعداد تو مشہور رہی ہے، لیکن شاہجہاں کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتی ہے کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اسکو سمجھ سکتا ہے، اگر شاہجہاں کی تاریخ کے ساتھ اسکے کمالات علمی کی بھی توضیح کیجائے تو کیا اچھا۔"

سعد اللہ خاں وزیر نے شاہجہاں کے حکم سے اس باب میں ملا صاحب کو جو خط لکھا ہے وہ بھی اس رسالے کے ساتھ شامل ہے اور اس کی نقل حسب ذیل ہے۔"

اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے اس خط کو نقل کیا ہے۔ ہم اسے بعد میں دوسرے نسخے کے ساتھ موازنہ کر کے نقل کریں گے، یہاں صرف محلات نظر کی نشاندہی کیجاتی ہے:

محلات نظر: (۱) ۱۰۵۷ھ رسالہ کا سال تصنیف ہے، مخطوطہ کا سال کتابت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں مرقوم ہے

"ولیکن ھذا آخر ما اردنا ایرادہ فی ھذہ الرسالۃ الخاقانیۃ حامداً للہ تعالی ومصلیاً علی نبیہ وآلہ شان عاقی تحریر مسودتہ یوم الجمعۃ خامس شھر ربیع الثانی ثمانی آخر یوم الجمعۃ ثانی عشر منہ من ۱۰۵۷ھ"

(۲) مقالہ نویس نے ایک بحث کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہے مسئلہ حشر اجساد۔ اصل مناظرہ میں تین مسئلے پیش نظر تھے: عالم کا حدوث و قدم، حشر اجساد کا اقرار و انکار اور علم باری تعالی بجزئیات مادیہ کی تائید یا تردید۔ ان میں سے رسالہ میں پہلے دو مسئلوں سے یونہی سا تعرض کیا گیا ہے۔ صرف تیسرے مسئلے سے بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۳) ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ۱۰۵۷ھ رسالہ کا سال تصنیف ہے (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

ذکر مخطوطہ کا سنہ کتابت۔

(۴) لیکن اس زمانہ میں جبکہ قدیم اور جدید کے درمیان بعد المشرقین پیدا ہو چکا ہے، اس عبقری وقت کا تعارف ضروری ہے۔

(۵) ایسا نہیں ہے، بلکہ علم و حکمت کی نشر و اشاعت شاہانِ وقت کے "ارسال ہدایا و تحف" سے بے نیاز تھی۔

(۶) اور ترکی کے علماء کی تصانیف مثلاً "خیالی" کس طرح ہندوستان میں اکثر داخلِ درس ہوئیں؟

(۷) ۱۰۶۸ھ میں سفیر بنا کر ایران بھیجا گیا تھا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

(۸) عراق سے آجکل کا عراق مراد نہیں ہے، بلکہ عراق عجم جو مغربی ایران کا نام تھا۔

(۹) خلیفہ سلطان خود نہیں آیا، بلکہ اس کے خاندان کے کچھ افراد آئے تھے۔

(۱۰) خلیفہ سلطان کا نہیں، بلکہ اس کی اولاد کا ذکر ہے۔

(۱۱) خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ اس کا لقب تھا۔

(۱۲) "شاہجہانی سفراء" نہیں بلکہ شاہجہاں کا سفیر (جان نثار خاں) اور سفارت خانہ کا عملہ۔

(۱۳) اس ادعائے ہمہ دانی کا تو سلطنت کی عزت سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ محض سفارت خانہ کے عملہ کی بو الفضولی ہی تھی۔ البتہ جب ان بو الفضولوں کو اس مناظرے میں منہ کی کھانا پڑی تو ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا اور اسی لیے یہ رسالہ لکھوایا گیا۔

(۱۴) تیسرا مسئلہ (حشر جسمانی) پھر بیان ہونے سے رہ گیا ہے،

(۱۵) اس مکتوب کا جو دوسرا نسخہ تذکرہ باغستان میں منقول ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ مناظرہ ہوا جس میں ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ کو شکست ہوئی، اس پر شاہجہاں کو اطلاع دی گئی۔

Marfat.com

(۱۶) "سلاطین کو اس مسئلہ سے دلچسپی" کا سوال نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا معاملہ تھا۔

(۱۷) بیس و پیش زمانہ میں نہیں، بلکہ پورے دو سو سال پہلے، کیونکہ یہ گیارہویں صدی کے وسط میں لکھا گیا تھا۔ اور سلطان محمد فاتح نے "تہافت الفلاسفہ" امام غزالی اور "تہافت التہافت" ابن رشد پر محاکمہ نویں صدی ہجری کے وسط میں کرایا تھا۔

(۱۸) اس لفظ "موحی فواردی" کو نہیں پڑھا جا سکا۔ ممکن ہے "مولیٰ خواجہ زادہ" ہو مگر کتاب الذخیرہ" ان کی تصنیف نہیں ہے۔ یا "مولیٰ علاء الدین طوسی" ہو مگر اس تصحیف سے اقرب نہیں ہے۔

(۱۹) یہ فاضل مقالہ نگار کی قیاس آرائی ہے کہ "شاہان مغلیہ کے الفاظ کو احکام میں بعینہ نقل کیا جاتا تھا۔" ورنہ وزیر یا دفتر کا سربراہ شاہی مراسلات کا مسودہ تیار کرتا تھا اور بادشاہ اس پر دستخط کرتا تھا یا مہر لگاتا تھا۔ لہذا "چند جملے" اور مسائل مجوزہ کی تفصیل سعد اللہ خاں علامی کی کاوش ذہن کا نتیجہ ہیں۔

اس خط کا ایک دوسرا نسخہ "تذکرہ باغستان" میں محفوظ ہے جو میرے خیال میں زیادہ قابل اعتماد ہے، بہرحال دونوں نسخوں کی مدد سے اس خط کی نقل ذیل میں پیش کیا جا رہی ہے۔

| علامی سعد اللہ خاں کا مکتوب | "افادت پناہ افاضت دستگاہ جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول

وحید العصر فرید الدہر باد واک نشاتین و احراز دارین کامیاب باشند۔ حسب الحکم اشرف می نویسد کہ چوں اذ افراد و وقائع ایران بمسامع مجامع رسید کہ افادت پناہ افاضت دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و مجیب ملی واقعہ نویس کہ بامارت مآب جان نثار خاں سفیر متعین اند بس از دعوائے ایشان بفضل کمال و

پرسید کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم و نفی علم واجب تعالیٰ شانہٗ کما یقول الظالمون
فی حق انفسہم والجاہلون باشد جہلاً مرکبا) بجزئیات مادیہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی
و شیخ ابو علی سینا نمودہ۔ وجہے تاویل کلام حکما کردہ اند۔ ایں مراتب را تقریر باید کرد۔ مدعیان
دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ اند و از مسلک معقولیت دور افتادند۔ لہٰذا اکبترین
مریدان حکم شد کہ باں فضائل و کمالات دستگاہ سطرے چند برنگارد و برگزارد کہ آں افادت
و افاضت مرتبہ را دریں مسائل مختصرے جامع و موجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکما و تاویلات
علماء و وجہ تکفیر اسلامیین و اقوال طرفین و مباحثات و مناظرات و شکوک و شبہات و ازالات
و ازاحات و اسولہ و اجوبہ و نہایت تدقیقات و نہایت تحقیقات و اہل کلام در ہر باب
و اساس سخن در ہر جواب و آنچہ براں ظفر یافتہ باشند و برہان بداں فائز شدہ باشند۔ و احاطہ
مسائل متعلقہ بمطلب علم از حضوری و حصولی بودن و علم عین عالم و عین معلوم یا غیر آں و
تعلق آں بجزئیات بروجہ کلی است یا بروجہ جزئی و تحریر آنکہ کلیت و جزئیت مفہوم تابع
مدرک یا تابع مدرک است و نسبت واجب جزئی ہست یا نہ۔ و بیان آنکہ ادراک تعقلی
است یا احساسی۔ و شمول علم بغیبات و مشخصات از زمان و غیر آں۔ و بقائے علم با تغیر
نوم و تبدل زمان۔ و حضور زمان بجمیع اجزائہ من ازل الآزال الی ابد الآباد مع کونہ
غیر قارہ و غیر آں باشد نوشتہ در حضرت خلافت مرحمت دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ
بایران فرستادہ شود۔ و آں چناں باید بود کہ قابل فرستادن و لائق اضافت باں
فضائل دستگاہ بود و بر روزگار ازاں آثار گویند و در تاریخ ہا نوشتہ آید۔"

الدرۃ الثمینہ کا مصنف، نام و نسب[لہ] الدرۃ الثمینہ کے مصنف علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جو نہ صرف

لہ ملاحظہ ہو مجلات نظریہ نمبر (۴)

اپنے وقت کے ملکِ ہندوستان کے ایک عظیم المرتبہ فاضل تھے: پدر بزرگوار کا نام شمس الدین تھا جو غالباً اپنے دیگر ابناءِ وطن کی طرح کشمیر سے سیالکوٹ میں آ بسے تھے۔

تعلیم و اساتذہ | ابتدائی تعلیم کی تفصیلات تاریخ نے محفوظ نہیں رکھیں لیکن اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کشمیر کے ایک جلیل القدر استاد ملا کمال الدین سے کی میر غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

"در عنفوانِ سن تمیز دامن ہمت بطلب علم برزد و بیشتر نزد ملا کمال الدین کشمیری کہ متوطن بلدۂ سیالکوٹ و بلند پرواز عالم ملکوت بود، تلمذ نمود" (مآثر الکرام، ص ۲۰۴)

اُن سے پہلے عبد الحمید نے بادشاہ نامہ میں لکھا تھا:-

"اکثر علوم نزد ملا کمال کشمیری کہ در سیالکوٹ مسکن داشت و بازار باطنی روشن، تلمذ نمودہ است"

ملا کمال الدین اپنے بھائی مولانا جمال الدین کی طرح کشمیر کے ایک صاحب دل شیخ اور عالم بابا فتح اللہ کے داماد اور شاگرد تھے، چنانچہ محمد اعظم کشمیری نے "واقعات کشمیر" میں لکھا ہے:-

"مطلع الانوار لایزالی اخوند ملا کمال برادر مولانا جمال است۔ حلال دقائق وکشاف حقائق بود۔ نسبت علمی غالب داشت چنانچہ برادر عالی قدرش راجہت تقوی راجح بود .... در سیالکوٹ و لاہور مسند افادہ علوم بیارا ست و طلبے از فیض خدمتش بصاحب کمالی برخاست ...... طلبائے بسیارش مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی از خدمتش مستفید گردید"

اسی زمانہ میں علامہ عبد الحکیم کے تعلقات حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ استوار ہونا شروع ہوئے اور علامہ عبد الحکیم ہی نے حضرت مجدد صاحب کے قوتِ مناظرہ سے متاثر ہو کر انھیں "اسد العلماء" کے نام سے موسوم کیا، لیکن بعد میں دونوں دوستوں نے مختلف راہیں اختیار کیں: علامہ نے مسندِ درس و افادہ کو زینت بخشی اور مجدد صاحب نے رشد و ہدایت اور تجدید و اصلاح کے فرائض کو

Marfat.com

انجام دیا۔

بہرحال باکمال استاد کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھا کہ سیالکوٹ کا یہ لائق سپوت عرصۂ قلیل میں جملہ علوم و فنون کے اندر دستگاہ عالی حاصل کر کے خود تشنگان علم و حکمت کو فیض پہنچانے لگا، آزاد بلگرامی نے ان کے تلمذ کے بعد لکھا ہے :۔

"در فرصت کمی ہلال استعدادش بدر کامل گشت ...... عرصہ جہان را بلوامع فیض مملو ساخت"

درس و تدریس کا آغاز شروع میں اپنے بیشتر معاصرین کی طرح علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی دربار سلطنت سے دور اور شاہی جود و سخا سے بے نیاز ہو کر خود کو نشر علوم کے لیے وقف کر دیا، یہ جہانگیر کا زمانہ تھا، چنانچہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

"در عہد جہانگیری بہ معاش ضروری ساختہ در وطن مالوف بسری برد"

اسی طرح عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں لکھا تھا:

"در ایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بعضو وجہ بات معیشت در ساختہ عزلت گزین بود"

مگر اس عزلت گزینی کے باوجود ان کے فضل و کمال اور جلالت علمی کا شہرہ دربار تک پہنچے بغیر نہ رہ سکا، چنانچہ معتمد خاں نے "اقبال نامہ جہانگیری" میں منتخب روزگار فضلائے عہد کی جو مختصر فہرست دی ہے اس میں علامہ عبدالحکیم کا نام بھی ہے، حالانکہ ان کے سوا ان کے معاصرین و متاخرین میں سے کسی کا بھی ذکر نہیں ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ شروع ہی سے علمی دنیا میں منفرد اور نمایاں تھے۔

عہد شاہجہانی اور دربار تک رسائی ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا، اس نے علم و ادب کی سرپرستی کے نئے دور کا آغاز کیا، میر غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

"چوں نوبت فرمانروائی ہندوستان بہ صاحب قران شاہجہاں انار اللہ برہانہ رسید ...

Marfat.com

فالغہ علماء و شعرا امارو اجے دیگر پیدا شد" (مآثر الکرام صفحہ ۲۴۴-۲۴۵)

علامہ عبدالحکیم بھی جو "دستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" پر عامل تھے، قدر شناس بادشاہ کی تربیت سے محروم نہ رہ سکے، اسی زمانہ میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا جو اپنی نوعیت کا منفرد علمی کارنامہ تھا، اس کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اس کی جوہر شناس نگاہ نے امید سے زیادہ قدر افزائی کی، اس سے علامہ کے حوصلے بڑھ گئے اور اس کی تکمیل میں لگ گئے۔ (اس کی تفصیل انھوں نے اپنے "حاشیہ تفسیر بیضاوی کے دیباچہ میں دی ہے)۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سی تصانیف بادشاہ کے نام پر معنون کیں اور اس سلسلے میں بار بار دربار میں بلائے گئے اور شاہی انعامات سے نوازے گئے، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"ملا دریں عہد بارہا خود را بدرگاہ خلافت رسانید، ہرگاہ وار د حضوری گردید۔ بہ رعایت نقود نامحدود مخصوص می گشت۔ دو بار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت و چند قریہ بہ رسم سیورغال انعام شد۔"

دوسرے وجوہ داعیان مملکت کی طرح علامہ سیالکوٹی بھی جب کبھی شاہی دربار میں تشریف لاتے تو ان کی آمد دربار کا وقائع نویس سرکاری تاریخ میں قلمبند کرتا، عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس قسم کی متعدد تقریبات کا ذکر کیا ہے۔

مناظرے: ان کے زمانہ میں جب کبھی دربار میں کوئی مدعی علم و فضل سر اٹھاتا تو اس کے مقابلے کیلئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کو زحمت دیجاتی، جب ملا شفیعا ایران سے آیا اور اس کے علم و فضل کا شہرہ بڑھا تو علامہ ہی کو اس سے مناظرے کے لیے بلایا گیا، اس مناظرے کی تفصیل امام الدین ریاضی نے تذکرہ باغستان میں دی ہے:

" آوردہ اند کہ بادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ

Marfat.com

از ولایت آمدہ بود وخطاب دانشمند خاں یافتہ بطلبید۔ ایشاں آمدند واجلاس علماء و فضلا شد۔ چوں نوبت سخن بمولوی عبد الحکیم رسید با دانشمند خاں مناظرہ واقع شد برمراد ایک نعبہ وایک نستعین۔ گفتگو بطول کشید وبالآخر درستی قول وراستی سخن ایشان برپادشاہ وسائر علماء وامراء عالی شان انجامید۔" (باغستان ص ۴۴۹ ب ۵۰۵ و الف)

مگر علامہ بحاث محض ہی نہ تھے، حق پسند اور منصف مزاج بھی تھے، ایک مرتبہ ملا محمود جونپوری سے مسئلۂ وحدت الوجود کے باب میں مناظرہ ہوا تو آخر میں علامہ نے فریق مقابل کی برتری کا اعتراف کر لیا۔ امام الدین ریاضی نے دوسری جگہ لکھا ہے:۔

"ملا محمود جونپوری در فروع واصول ومعقول ومنقول بکمال رسیدہ بود .... مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی باوجود کمال خود بکمال جامعیت او اقرار واعتراف بفضل ودانش اومی نمود .... مولوی عبد الحکیم در مناظرہ علم توجیہ با وے مقاومت نداشت۔ می فرمود کہ مولانا نفس قدسی است، تار وپود سخن را خاصہ بمنقولات بمنوالے بافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او بمصداق وان اوہن البیوت لبیت العنکبوت ست تر از نسج عنکبوت است۔" (باغستان صفحہ ۴۴۹ ب ۵۰۶ الف)

یہ علامہ کی حق پسندی تھی ورنہ وہ بڑے بڑے اکابر سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ قاضی عبد الوہاب سے جو قاضی القضاۃ تھے، کسی مسئلے میں مناظرہ ہو رہا تھا، علامہ بڑے جوش وخروش سے بول رہے تھے، قاضی صاحب نے کہہ دیا "مرد آدمی سخن آہستہ گو۔" پھر کیا تھا، علامہ بگڑ گئے اور قاضی القضاۃ کے منصب کا خیال کیے بغیر انھیں ڈانٹ دیا۔

علامہ کی علم دوستی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ مولانا عوض وجیہ لکھنؤ سیاحانہ وضع میں علامہ کے درس میں تشریف لے گئے اور دوران تقریر میں علامہ پر اعتراض کیے، تمام کر

Marfat.com

علامہ کی سعد اللہ خاں علامی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اس نو وارد سپاہی کے اعتراضات کا ذکر کیا، علامی سعد اللہ خاں سمجھ گئے، بولے ارے تو وہ تو مولانا عوض وجیہ ملجی تھے۔ مولانا نے سنا تو حسرت و اشتیاق کے ساتھ فرمانے لگے۔

"زآمدنش اگر خبر داشتمے درہ گزرش گل و یاسمن کاشتمے"

معاصرین و حریف

علامہ علم و فضل کے آفتاب نہیں تھے، ماہتاب تھے۔ اس عہد کے آسمان علم و فضل پر بیشمار درخشاں ستارے روشن تھے، بدر منیر علامہ کی ذات تھی، شاہجہاں کی علمی سرپرستی و جوہر شناسی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، اس عہد کی مشہور شخصیتوں میں بادشاہ کے وزیر علامی افضل خاں اور علامی سعد اللہ خاں کے علاوہ میرک شیخ ہروی، ملا علاء الملک تونی، سید احمد سعید، قاضی محمد اسلم، ملا عبد اللطیف، میر محمد ہاشم، شیخ عبد الحق محدث، ان کے صاحبزادے مفتی نور الحق، مفتی حسام الدین، مفتی رکن الدین، ملا عبد السلام لاہوری، مفتی عبد السلام دیوی، مولانا یوسف کیاہی، مولانا جمال الدین تلوی، مولانا الہداد، ملا فاضل بدخشی۔ ملا محمد افضل اور ان کے دو شاگرد ملا محمود جونپوری (مصنف شمس بازغہ) اور شیخ عبد الرشید جونپوری (مصنف مناظرۂ رشیدیہ) قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ کشمیر میں بھی جلیل القدر علماء تھے، جیسے قاضی ابو القاسم، مولانا حیدر فیروز، مولانا داؤد مشکوتی، ملا باقر صباغ، ملا باقر نارہ، ملا ذہنی، ملا ابو الفضل عرف شاہم بابلہ۔ ان میں سے اکثر ان کے حریف نقاد تھے جیسے ملا باقر نارہ، جن کے بارے میں صاحب "واقعات کشمیر" نے لکھا ہے:-

"ملا باقر نارہ علو در معقولات شاگرد ملا باقر صباغ بودہ در ہندوستان با ملا عبد الحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ کردہ و آنہا را ملزم می کرد"

ملا فاضل جن کے بارے میں محمد اعظم کشمیری نے لکھا ہے:

"ملا فاضل مجرد دانشمند مدقق بود بے بدیل و بجائی اشتہار یافتہ اکثر حواشی ملا عبد الحکیم سیالکوٹی را رد می نوشت"

Marfat.com

شاہجہاں کے بارے میں یہی مصنف لکھتا ہے :۔

"ملا ابوالحسن معروف بشاہجہاں در علوم مستعد وجیہ بود ...... اکثر مذکورات ملا عبدالحکیم را روحی کرد و گاہے التفات بجانب علماے حاضر نمی کرد ۔"

ہندوستانی فضلا میں مفتی عبدالسلام دیوی کا نام قابل ذکر ہے ، انکے ساتھ علامہ کی غلط فہمی کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس کی تفصیل آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں میر اسمٰعیل بلگرامی کے تذکرے میں دی ہے بہرحال علم و فضل کے اعتبار سے یہ بڑا روشن دور تھا : اور بیشمار علما ، و فضلاء سے مملکت شاہجہانی کی زیب و زینت تھی ، مگر جب ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا تو شاہجہاں کی جوہر شناس نگاہوں نے ان درخشاں ستاروں میں سے اسی مہ کامل کو انتخاب کیا (اس کی تفصیل "الدرۃ الثمینۃ" کی وجہ تصنیف کے ضمن میں آگے آئیگی)

اور یہ اس فاضل عہد کی جلالت قدر اور علوئے مرتبت کی سب سے بڑی دلیل ہے .

وفات | علامہ سیالکوٹی نے ۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا ، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :۔

"دوازدہم ربیع الاول سنہ سبع وستین والف طومار حیات پیچید و در سیالکوٹ مدفون گردید"

اولاد امجاد و تلامذہ | تاریخ میں علامہ کی اولاد امجاد میں سے ان کے صاحبزادے مولانا عبداللہ لبیب کا نام مذکور ہے ، علامہ کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ رکھتے تھے ، چنانچہ بہت سی کتابیں ان ہی کے واسطے تصنیف کیں ۔

مولانا عبداللہ لبیب بھی اپنے وقت کے جید عالم تھے ، "توضیح تلویح" پر ان کا حاشیہ مشہور ہے . ایک رسالہ وحدت الوجود کی تائید میں عالمگیر کی استدعا پر مرتب کیا تھا جیسا کہ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے :۔

"آوردہ اند کہ بادشاہ بدیشان گفت کہ واند شما مسئلۂ وحدۃ الوجود چہ طور تلقین شما کردہ اند۔ آنرا می خواہیم از زبان شما شنویم کہ گویا از مولوی مرحوم شنیدہ باشیم ایشان خود دراں وقت بجواب اجمالی کہ مقتضائے وقت بود اکتفا کردند و گفتند کہ چوں ایں سخن شرح طلب است، اگر ارشود نیز ودی رسالہ موجزے در حل ایں رمز شگرف تحریر نمودہ بسمع مبارک رساند۔ فرمود بہتر۔ چنانچہ اخوند در اندک فرصتے رسالہ بسیار خوب در حل مسئلہ وحدۃ الوجود تصنیف کردہ بعرض رسانیدہ و فقیر ایشان را ہم دراں ایام دریافتہ آں رسالہ حاصل نمودہ بمطالعہ در آوردہ۔"

(باغستان، ص ۲۰۶ ب)

لیکن علامہ کا علمی فیض انکے تلامذہ کے ذریعے زیادہ پھیلا۔ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے:۔

"و بالجملہ از رایات جلال او شاگردان صاحب کمال اند از انجملہ است، ملا سعد اللہ مخاطب بسعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ صاحبقراں کہ نشان مذکور از فضل او نشان می دہد...... و از انجملہ است ملا عبد العزیز عزت کہ در زمان خلافت عالمگیر خدمت عرض مکرر داشت...... و از انجملہ است ملا عصمت اللہ سہارنپوری کہ بر خلاصۃ الحساب و تشریح الافلاک شیخ بہاء الدین محمد عاملی شرح نوشتہ اند و از رایات کمال او فرزند صاحب حال است مولوی عبد اللہ" (باغستان صفحہ ۲۰۰ الف)

ان کے علاوہ ان کے ایک اور شاگرد مولوی عبد الرحیم مراد آبادی تھے، جن کے سلسلۂ تلمذ میں قاضی مبارک گوپا مئوی (شارح سلم العلوم) شمار ہوتے ہیں، ایک اور شاگرد میر اسمٰعیل بلگرامی تھے، جو پہلے مفتی عبد السلام دیوی کے شاگرد ہوئے تھے۔

تصانیف | علامہ کثیر الدرس ہونیکے ساتھ ساتھ کثیر التصنیف بھی تھے، آزاد بلگرامی نے انکی

Marfat.com

کتابوں کی ایک مبسوط فہرست دی ہے جو حسب ذیل ہے:-

۱۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی
۲۔ حاشیہ مقدمات تلویح
۳۔ حاشیہ مطول
۴۔ حاشیہ شریفیہ
۵۔ حاشیہ شرح مواقف
۶۔ حاشیہ شرح عقائد تفتازانی
۷۔ حاشیہ حاشیۂ خیالی
۸۔ حاشیہ شرح شمسیہ
۹۔ حاشیہ حاشیہ عبدالغفور
۱۰۔ تکملہ حاشیہ عبدالغفور
۱۱۔ حاشیہ شرح مطالع
۱۲۔ حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی
۱۳۔ درہ ثمینہ در اثبات واجب تعالیٰ (؟)
۱۴۔ حواشی در کنار شرح حکمۃ العین
۱۵۔ حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمۃ
۱۶۔ حواشی در کنار مراح الارواح

ان میں سے ہمارے نقطۂ نظر سے "درہ ثمینہ" سب سے زیادہ اہم ہے، اسی کا تعارف کرایا جاتا ہے، آزاد بلگرامی نے اس کا موضوع اثبات واجب تعالیٰ بتایا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کی توضیح اگلی قسط میں پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(معارف: جون ۱۹۶۸ء)

۲

ء

ب ۔ الدرۃ الثمینہ کا علمی پس منظر

[دیکھئے مکالمات نظریہ سے شمارہ (۳) و (۱۴)]

فاضل مقالہ نویس نے لکھا تھا:۔

" رسالہ میں علم باری تعالیٰ اور مبحث قدم عالم کو نہایت خوبی سے لکھا ہے۔"

آگے چل کر پھر فرمایا تھا:۔

" وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے (تہافت الفلاسفہ میں) مسئلہ قدم عالم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے سبب سے شیخ ابو نصر فارابی اور بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے۔"

Marfat.com

علامہ سیالکوٹی نے "علم باری تعالیٰ" کی تفصیلی بحث کے بعد امام غزالی کے حوالے سے لکھا ہے :-

قال الامام حجۃ الاسلام فی	امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنے کسی رسالہ میں
بعض رسائلہ عن مجموع ما غلط	لکھا ہے کہ فلاسفہ کی جملہ غلط کاریاں ان کی
الفلاسفۃ فیہ یرجع الی عشرین	بیس اصلوں کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے تین
اصلا یجب تکفیرھم فی ثلثۃ	مسئلوں کے اندر ان کی تکفیر واجب ہے۔
منہا..... من ذلک قولھم ان	.....ان میں سے پہلا تو ان کا یہ قول ہے کہ
الاجسام لا یحشر وان المثاب	اجسام مرنے پیچھے اٹھائے نہ جائیں گے اور یہ کہ
والمعاقب ھی الارواح المجردۃ	جس کو ثواب یا عذاب ہوگا وہ صرف
..... ومن ذلک قولھم ان اللہ تعالیٰ	ارواح مجردہ ہیں..... اور ان میں دوسرا ان کا
یعلم الکلیات دون الجزئیات	یہ قول ہے کہ باری تعالیٰ کو صرف کلیات کا
وھذا ایضا کفر صریح......	علم ہوتا ہے نہ کہ جزئیات کا اور یہ صریح کفر ہے۔

Marfat.com

عبد الحکیم سیالکوٹی نے   اتنی اہمیت دی ہے کہ "قدم عالم" کے مبحث سے پہلے اس کا ذکر کر کے اس کے قائلین کی تکفیر کی ہے، فرماتے ہیں :-

اقول تکفیرھم بانکار الحشر	میں کہتا ہوں کہ حشر جسمانی کے انکار کی
الجسمانی حق لانہ مما نطق	بنا پر فلاسفہ کی تکفیر بالکل درست ہے کیونکہ
بہ الکلام المجید ... قال الامام	یہ (حشر جسمانی) ان تعلیمات میں سے ہے جن کی
الرازی لا یمکن الجمع بین الایمان	قرآن نے صاف صاف تصریح کی ہے ....
... وانکار الحشر الجسمانی .... وفی	امام رازی نے کہا ہے کہ ایمان .... اور حشر جسمانی کے
شرح المواقف: واما وقوع الحشر	انکار کے درمیان تطبیق نہیں ہو سکتی (حشر
الجسمانی فلان الصادق الذی	جسمانی کے انکار کے بعد ایمان باقی نہیں
علم صدقہ قاطبۃ خبر عنہ	رہتا) ... اور "شرح مواقف" میں ہے:
فی مواضع ... حتی صار معلوماً	رہا حشر جسمانی کا واقع ہونا تو چونکہ جس
بالضرورۃ کونہ من الدین القویم	راست گو ہستی کی راست بیانی پورے
.... فمن اراد تاویلہا .... فقد کابر	جزم و یقین کے ساتھ معلوم ہے، اس نے
بانکار ما ھو من ضروریات	اس کی کئی جگہ خبر دی ہے .... یہاں تک کہ
ذلک الدین "	اس کا دین قویم میں سے ہونا یقینی ہو گیا
	.... پس جس شخص نے اسکی تاویل کی کوشش کا
	ارادہ کیا ... تو اس نے ان چیزوں کے انکار

۴ کے ساتھ مکابرہ کیا جو اس دین کی ضروریات میں سے ہیں۔

Marfat.com

علامہ سیالکوٹی کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ انھوں نے "الدرۃ الثمینہ" میں "علم باری تعالیٰ" اور "مبحث قدم عالم" کے علاوہ "حشر اجساد" کے مسئلہ کی بھی باحسن وجوہ تشریح کی تھی

جہاں تک ثانی الذکر (مسائل ثلثہ کے علمی و فکری پس منظر) کا تعلق ہے، اس کے لیے علم کلام کی تاریخ بالخصوص اس فن میں امام غزالی کی مساعی علمیہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے، اس غرض سے اس کا ایک اجمالی جائزہ دیا جاتا ہے۔

علم کلام کی ماہیت اور موضوع | "شرح مواقف" میں علم کلام کی تعریف یہ کی گئی ہے :-

الکلام علم یقتدر معہ اثبات العقائد الدینیۃ بایراد الحجج ودفع الشبہۃ"۔ (شرح المواقف، الموقف اول، مرصد اول، مقصد اول)	علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعہ عقائد دینیہ کے ثابت کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے، اس طرح کہ ان کے ثبوت میں دلائل لائے جائیں اور ان پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کو دفع کیا جائے۔

اس طرح علم کلام ایک بہت ہی وسیع علم ہے جس میں امہات عقائد اسلامیہ یعنی توحید باری تعالیٰ، نبوت محمدی اور حشر اجساد جیسے اہم مسائل کے اثبات سے لیکر فروعی اور ثانوی اہمیت کے اختلافات تک داخل ہیں۔

مگر "الدرۃ الثمینہ" ان تمام مسائل بلکہ جملہ امہات عقائد کے اثبات پر بھی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں صرف تین اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے یعنی

(الف) نفی قدم عالم

Marfat.com

(ب) اثبات حشر اجساد، اور

(ج) شمول علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ۔

مگر ایسا کیوں ہے؟ اس کی ایک طویل تاریخ ہے، ذیل میں اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم کلام کا آغاز اسلام ابتداً عرب میں مبعوث ہوا، جس کے "سوز دروں" نے اس کی فطری، معقول، انسان دوست اور منصفانہ تعلیمات کا انتہائی خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ لیکن جب اس کا واسطہ "عجم کے حسن طبیعت" سے پڑا تو پھر اسے ان تعلیمات کو عقل کی کسوٹی پر کس کر پیش کرنے کی ضرورت ناگزیر ہو گئی، یہی فکری سرگرمی (اسلامی تعلیمات کی عقلی توجیہ) "علم کلام" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کے قدیم ترین نمائندے جنھوں نے ایک منظم علم کی حیثیت سے اس کی (اصطلاحی علم کلام کی) تدوین کی معتزلہ (معتزلہ ثالثہ) تھے، جن کا بانی واصل بن عطا الغزال کو قرار دیا جاتا ہے۔

ابتدا میں یہ قیل و قال اور اس سے متعلقہ فکری سرگرمی صرف مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان تک محدود تھی، جن میں اسلام کی اصولی تعلیمات متفق علیہ تھیں۔

علم کلام کا یہ دور "کلام المتقدمین" کہلاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری کے ربع ثانی میں سیاسی انقلاب کے ساتھ ثقافتی اور فکری انقلاب بھی رونما ہوا۔ امویوں کے بجائے عباسی خاندان عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آیا (۱۳۲ھ)۔ عباسیوں کی تخت نشینی گویا خسرو نوشیرواں کا احیا تھی۔ علم حکمت کی سرپرستی کے نام سے مختلف اقوام کے ذہنی و فکری سرمایہ کو عربی میں منتقل کیا گیا، ان میں سب سے اہم یونانی فلسفہ تھا، جس سے اسلامی تعلیمات کا تصادم ہوا، اس کے نتیجے میں قیل و قال اور فکری

سرگرمیوں کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اور اس کے حیطۂ عمل میں خود اسلام کی بنیادی تعلیمات یعنی توحید باری، نبوت محمدی اور ایمان بالآخرۃ بھی آ گئے۔

اب مفکرین اسلام کی فکری سرگرمیاں "کلام باری" اور "جبر و اختیار" کے مسائل سے آگے بڑھ کر توحید باری تعالیٰ، نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعثت بعد الموت کے عقلی دلائل تک پہنچ گئیں۔

علم کلام کا یہ دور "کلام المتاخرین" کہلاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سعد الدین تفتازانی نے "شرح عقائد نسفی" کے دیباچہ میں لکھا ہے :-

لما نقلت الفلسفة عن اليونانية	پھر جب فلسفہ یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوا
الى العربية وخاض فيها الاسلاميون	اور مسلمانوں نے اس میں غور و خوض کیا
وحاولوا الرد على الفلسفة	اور جن امور میں فلسفہ نے شریعت کی
فيما خالفوا فيه الشريعة	مخالفت کی تھی، اس کی تردید کا ارادہ کیا
فخلطوا بالكلام كثيراً من الفلسفة	تو کلام میں فلسفہ کے بہت سے مسائل ملا دیے
ليتحققوا مقاصدها فيتمكنوا	تاکہ ان کی تحقیق کر سکیں اور ان کے
من ابطالها (شرح عقائد نسفی ص)	ابطال پر قادر ہو سکیں۔

لیکن بات یہیں تک محدود نہیں رہی، بلکہ جب مفکرین اسلام کو دیگر ادیان کے متبعین بالخصوص فلسفہ کے پیروؤں سے تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا تو قدیم مسیحی متکلمین (دستادو یعنا) کی طرح انھوں نے دو موقف اختیار کیے :۔

بعض لوگوں نے ان مسائل کو جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم تھے، باطل کرنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ "متکلمین" تھے، اور ان کی فکری سرگرمیاں "علم کلام" (یا کلام متاخرین) کہلاتی ہیں۔

Marfat.com

لیکن کچھ لوگوں نے فلسفہ کی دلکشی سے مسحور ہو کر یونانی فلسفہ کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تاویل و توجیہ پر اصرار کیا، یہ لوگ "فلاسفۂ اسلام" یا "حکمائے اسلام" کہلائے۔

اس کے بعد فطری تھا کہ ان دونوں تحریکوں کے نمایندوں میں ایک مسلسل فکری نزاع کا سلسلہ قائم ہو، یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاتا رہا، اسلام کی فکری ثروت اسی کشمکش کی رہین منت ہے۔

علم کلام کا ارتقاء اس کشمکش کا آغاز عباسیوں کے آغاز اقتدار سے ہوتا ہے، عباسی چونکہ عجمیوں کی مدد سے برسر اقتدار آئے تھے۔ اس لیے نئے حکمرانوں نے ان کے معاملے میں زیادہ نرم پالیسی اختیار کی، مگر اس رواداری سے غلط فائدہ اٹھایا گیا، اور یکایک اسلام دشمن تحریکیں حرکت میں آگئیں، ان تحریکوں کا مقصد عربوں کی حکومت اور اسلام کی دینی تعلیمات کا استیصال کر کے ساسانیوں کی حکومت اور مجوسی مذہب کا احیاء تھا؛

پہلے اور دوسرے عباسی خلیفہ سفاح اور منصور کا زمانہ زیادہ تر انقلابی سرگرمیوں کی بیخ کنی اور اپنے علوی حریفوں کے استیصال میں گزرا، مگر تیسرے خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ-۱۶۹ھ) کو نہ صرف اس بڑھتے ہوئے خطرہ کا احساس ہوا، بلکہ اسے اس کے تدارک کے لیے بھی ضروری فراغت مل گئی، چنانچہ ایک طرف اس نے ان مفسدہ پردازوں کے استیصال کیلئے ایک خصوصی پولس افسر "صاحب الزنادقہ" کے نام سے مقرر کیا، دوسری طرف ان کے اصولی نظریات کی بیخ کنی کے لیے علماء و فضلاء کو مامور کیا۔ ان علماء و فضلاء میں سے جو جماعت اس کڑی کمان کو زہ کر سکتی تھی، وہ متکلمین کی جماعت تھی، مسعودی نے لکھا ہے:

وکان المهدی اول من امر	اور مہدی نے سب سے پہلے طبقۂ متکلمین
الجدلیین من اهل البحث	میں سے مناظروں کو بلا کر قاعدہ اور

من المتکلمین بتصنیف الکتب
فی الرد علی الملحدین ممن ذکرنا
من الجاحدین وغیرهم واقاموا
البراهین علی المعاندین وازالوا شبه
الملحدین واوضحوا الحق للشاکین

دیگر مخالفین کے رد میں کتابیں لکھوائیں،
انھوں نے (متکلمین نے) مخالفین کے مقابلے
میں دلائل قائم کیے، ملاحدہ کے شبہات
کا ازالہ کیا اور متشککین کے واسطے حق کو
واضح کیا۔

[الجزء ۲ ـ المطبعۃ الازہریۃ مصر]
[مروج الذهب ومعدن الجواہر برحاشیہ کامل

اس اہم فریضہ کی ادائیگی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان متکلمین نے جو بالعموم فرقۂ معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے، باقاعدہ فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا۔ شہرستانی نے لکھا ہے:

ثم طالع بعد ذلک شیوخ المعتزلة
کتب الفلاسفة حین فسرت ایام
المامون فخلطت مناهجها بمناهج
الکلام..... وکان ابوالهذیل
العلاف شیخهم الاکبر وافق
الفلاسفة..... ثم ابراهیم بن
سیار النظام فی ایام المعتصم
کان اعلیٰ فی تقریر مذاهب
الفلاسفة..... ثم ظهرت بدع
بشر بن المعتمر من القول بالتو
والافراط فیه والمیل الی الطبیعیین

اس کے بعد فلسفہ کی کتابیں مامون الرشید
کے زمانہ میں ترجمہ ہوئیں تو
مشاہیر معتزلہ نے، ان کا مطالعہ
کیا، اور اس طرح فلسفہ کے مناہج
کو علم کلام کے مناہج کے ساتھ خلط ملط
کر دیا..... چنانچہ ابوالہذیل العلاف جو ان کا
مشہور عالم تھا، فلاسفہ کا ہم زبان تھا.....
پھر ابراہیم بن سیار النظام جو معتصم باللہ
(۲۱۸ھ ـ ۲۲۷ھ) کے زمانہ میں تھا، اور
مذاہب فلسفہ کی تقریر میں دستگاہ عالی
رکھتا تھا..... پھر بشر بن المعتمر کی بدعتوں کا

نا: آیا جو تولید (علت ثانیہ) کا قائل تھا، بلکہ اس میں مبالغہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فلاسفہ میں سے گروہ طبیعین کی جانب میلان رکھتا تھا۔

من الفلاسفۃ (الملل والنحل للشہرستانی جلد اول ص ۲۰۱)

اس طرح متکلمین کی فکری مساعی سے فلسفہ کے رد و ابطال کا بڑا وافر لٹریچر ظہور میں آیا، اس ضمن میں مندرجہ ذیل متکلمین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں :۔

النوبختی : کتاب الآرا والدیانات

ہشام بن الحکم : کتاب علی ارسطا طالیس فی التوحید، کتاب الدلالات علی حدث الاشیاء اور کتاب الرد علی اصحاب الطبائع،

ابو ہاشم الجبائی : کتاب التصفح، کتاب النقض علی ارسطا طالیس فی الکون والفساد، کتاب الطبائع والنقض علی القائلین بہا۔

مگر سب سے اہم شخصیت امام ابو الحسن الاشعری کی تھی جو پہلے معتزلی تھے اور ابو ہاشم الجبائی کے باپ ابو علی الجبائی کے شاگرد رشید تھے، پھر تائب ہو کر اہل السنت والجماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ معتزلہ کے رد کے علاوہ انھوں نے فلاسفہ کے رد میں بھی متعدد کتابیں لکھیں، جیسے :

کتاب علی اہل المنطق

کتاب الفنون فی الرد علی الملحدین

الاستقصاء لجمیع اعتراض الدھریین وسائر اصناف الملحدین

کتاب علی الدھریین فی اعتقادہم فی قدم الاجسام،

Marfat.com

کتاب عن اعتلال من زعم ان الموات یفعل بطبعہ ونقضنا علیہم اعتلالاتہم واضحاتمویہاتہم،

کتاب الفصول فی الرد علی الملحدین والخارجین عن الملۃ کالفلاسفۃ والطبائعیین والدہریین

واہل التشبیہ والقائلین بقدم الدہر،

کتاب فی الرد علی الفلاسفۃ .... نقض علل ابن قیس الدہری،

الکلام علی القائلین بالہیولیٰ والطبائع،

نقض علل ارسطاطالیس فی السماء والعالم۔

نقض کتاب آثار العلویہ علی ارسطاطالیس۔

امام اشعری کے بعد ان کے متبعین نے بھی معتزلہ اور دوسرے بدعتی فرقوں کی اصلاح کے ساتھ فلاسفہ کی فکری بے راہ رویوں پر احتساب و انتقاد اور تردید و ابطال کا سلسلہ جاری رکھا۔ امام اشعری کے تلامذہ میں ابوالحسن الباہلی اور ابن مجاہد الطائی خصوصیت سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے شاگردوں میں تین فاضلوں نے شہرت حاصل کی: قاضی ابوبکر الباقلانی، ابواسحٰق الاسفرائنی اور ابن فورک۔ ان میں قاضی ابوبکر الباقلانی (المتوفی ۴۰۳ھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ "اعجاز القرآن" کے علاوہ ان کی "کتاب التمہید" بھی چھپ گئی ہے جس کا بڑا حصہ فلاسفہ اور دیگر ملاحدہ کے رد و ابطال پر مشتمل ہے۔

امام غزالی اور تہافت الفلاسفہ لیکن فلسفہ کی تردید و ابطال میں خصوصیت کا شرف امام غزالی کی "تہافت الفلاسفہ" کو حاصل ہے۔ یوں بھی امام صاحب کی شخصیت اسلامی فکر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ امام الحرمین، مصنف "کتاب الشامل فی علم الکلام"، کے شاگرد رشید تھے۔ اس زمانہ میں منطق و فلسفہ کا رواج عام ہو گیا تھا اور کلام و فلسفہ میں خلط ملط ہونے لگا تھا۔ اس لیے ضرورت سمجھی گئی کہ جہاں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا فلسفہ

Marfat.com

سے تصادم ہوتا ہو وہاں اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، اس نئے انداز بحث کا آغاز امام غزالی نے کیا، ابن خلدون لکھتا ہے :۔

وأول من كتب في طريقة الكلام	سب سے پہلے اس انداز پر علم کلام میں امام
على هذا المنهج الغزالي رحمه الله	غزالی نے لکھا پھر امام رازی اور دوسرے
وتبعه الإمام ابن الخطيب	لوگوں نے ان کی تقلید کی اور ان کے
وجماعة وقفوا اثرهم واعتمدوا	نقش قدم پر چلے اور ان کی تقلید پر
تقليدهم. (مقدمہ ابن خلدون)	اعتماد کیا۔

امام صاحب نے فلسفہ کے ابطال سے پہلے بڑی سنجیدگی اور ذمہ داری سے اس کا مطالعہ کیا اور اس کی تعلیمات کو "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے مرتب کیا، اس کے بعد فلاسفہ کے مواقف کو دیانتداری کے ساتھ متعین کرنے کی کوشش کی، اور اس کے لیے ارسطو کی تعلیمات کو منتخب کیا۔ چنانچہ "تہافۃ الفلاسفہ" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

ليعلم ان الخوض في حكاية اختلاف	جاننا چاہیے کہ فلاسفہ کے اختلافات میں
الفلاسفة تطويل فان خبطهم	غور و خوض تطویل لاطائل ہے کیونکہ ان کا
طويل ونزاعهم كثير وآراءهم	خبط طویل ہے، ان کی نزاعیں کثیر ہیں
منتشرة وطرقهم متباعدة	ان کے آراء و مذاہب میں پراگندگی ہے،
متدابرة - فلنقتصر على اظهار	ان کے مناہج بحث ایک دوسرے
التناقض في رأي مقدمهم	الگ ہیں۔ لہذا ہم ان کے پیشوا کی رایوں
الذي هو الفيلسوف المطلق	میں جو تناقض ہے اس کے اظہار پر
والمعلم الاول فانه رتب ..	اکتفا کریں گے۔ یہ پیشوا ارسطو ہے جو فلسفی

Marfat.com

علومهم وهذبها بزعمهم و	علی الاطلاق اور معلم اول ہے، اسی نے
وحذف الحشو من آرائهم	ان کے علوم کو مرتب کیا اور انکے گمان
وانتقى ماهو الاقرب الى	میں انھیں منقح کیا تھا، اور حشو و زوائد
اصول اهوائهم وهو ارسطاطاليس	کو حذف کر کے ان کے اصول مزعومات
(تهافتہ الفلاسفہ للامام غزالی	و مظنونات کو منتخب کیا تھا، اور وہ
مطبوعہ مطبعہ خیریہ ج اول ص ۳)	ارسطو ہے۔

لیکن خود ارسطو کے کلام کی توجیہ و تاویل میں اس کے تلامذہ و متبعین کے درمیان شدید اختلاف تھا، اور سریانی اور اس کے بعد عربی میں اس کی تصانیف کا ترجمہ ہونے کے بعد یہ اختلاف اور بڑھ گیا تھا، اس لیے امام غزالی نے ارسطاطالیسی فلسفہ کے نقد و تردید کے لیے اس کی ان ہی تعبیرات کو منتخب کیا جو ابونصر فارابی اور شیخ بو علی سینا سے منقول تھیں، چنانچہ آگے چل کر فرماتے ہیں :-

ثم المترجمون لكلام ارسطاطاليس	پھر جن لوگوں نے ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ
لم ينفك كلامهم عن تحريف و	کیا ہے، ان کا کلام بھی تحریف و تبدیل سے
تبديل محوج الى تفسير و تاويل	خالی نہیں ہے، اس لیے بجائے خود تاویل و
حتى اثار ذلك ايضاً نزاعاً	توجیہ کا محتاج رہا ہے، اس اختلاف تفسیر کی
بينهم واقومهم بالنقل	وجہ سے ارسطو کی مراد متعین کرنے کے بارہ
والتحقيق من المتفلسفة	میں اسکے متبعین کے درمیان بڑی نزاع
الاسلامية الفارابي ابو نصر	پائی جاتی ہے، فلاسفۂ اسلام میں اقوال ارسطو
وابن سينا. فلنقتصر على ابطال	کے نقل و تحقیق کے باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد

Marfat.com

ما اختاراه ورأياه الصحيح من مذاهب رؤسائهم في الضلال فان ما هجراه واستنكفا من المتابعة فيه لا تماري في اختلاله ولا يفتقر الى نظر طويل في ابطاله فليعلم انا مقتصرون على رد مذاهبهم بحسب نقل هذين الرجلين

(تهافت الفلاسفة للامام غزالی ج اول ص ٣-٤)

ابو نصر فارابی اور ابن سینا کی تصانیف ہیں، اسلیے مجوزہ ابطال وتردید کی کوشش میں ہم اسی چیز پر انحصار کرینگے جسے اپنے گروہ رؤسائے مذہب کے اقوال میں سے ان دونوں نے اختیار کیا ہے اور صحیح سمجھا ہے کیونکہ جس چیز کو ان دونوں نے چھوڑ دیا اور جس کی پیروی سے انھوں نے بے اعتنائی برتی ہو اس کے مختل ومشکوک ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور نہ اس کے ابطال کے لیے کسی غور وفکر کی ضرورت ہے، بس جاننا چاہیے کہ مذاہب فلسفہ کے رد کے بارہ میں ہم ان ہی دونوں فلسفیوں کی نقل پر اکتفا کرینگے

اس کے بعد انھوں نے ان مسائل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے مقدمہ کے بعد انھوں نے ان بیس مسائل کو لیا جن کے اندر فلسفہ اور شریعت کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔ ان مسائل پر گفتگو کی تفصیل غیر ضروری ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ تمام بنیادی اختلافات ہیں جن کی بنا پر فلاسفہ کی تکفیر واجب ہو، یا صرف بعض اساسی طور پر منافی اسلام ہیں، اس کا جواب امام صاحب نے کتاب کے خاتمہ میں یہ دیا ہے:-

فان قال قائل قد فصلتم مذاهب هؤلاء افتقطعون

پس اگر کوئی کہنے والا کہے کہ تم نے فلاسفہ کے مذہب کی تفصیل تو بیان کردی، پھر

Marfat.com

يكفرهم ووجوب القتل لمن يعتقد اعتقادهم، قلنا تكفيرهم لابد منه في ثلاث مسائل :-
احدها مسئلة قدم العالم وقولهم ان الجواهر كلها قديمة - والثانية قولهم ان الله تعالى لا يحيط علما بالجزئيات الحادثة من الاشخاص والثالثة في انكار بعث الاجساد وحشرها - فهذه المسائل الثلاث لا تلائم الاسلام بوجه ومعتقدها معتقد كذب الانبياء ...... وهذا هو الكفر الصريح الذي لم يعتقده احد من فرق المسلمين (تہافت الفلاسفہ امام غزالی ج اول ص ۹۰-۹۱)

تو بتاؤ کہ آیا تم قطعیت کے ساتھ انکی تکفیر نیز اس بات کے قائل ہو کہ جو ان کے معتقدات پر اعتقاد رکھتا ہو، اس کا قتل واجب ہے، تو اس کے جواب میں ہمارا کہنا ہے کہ تین مسئلوں میں ان کی تکفیر ناگزیر ہے :-
اول: قدم عالم کا قول اور فلاسفہ کا یہ کہنا کہ جواہر سب کے سب قدیم ہیں
دوم: فلاسفہ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا علم جزئیات حادثہ پر محیط نہیں ہے،
سوم: فلاسفہ کا بعث بعد الموت اور حشر اجساد کا انکار،
یہ تین مسئلے کسی طرح بھی اسلام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے اور ان کا اعتقاد رکھنے والا انبیاء علیہم السلام کے جھوٹ بولنے کا معتقد ہے .... جو صریح کفر ہے، اور جس پر اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کا اعتقاد نہیں ہے۔

امام غزالی اور فارابی وابن سینا کی بالواسطہ تکفیر

عام طور پر مشہور ہے کہ امام غزالیؒ نے مسائل ثلثہ (قدم عالم، انکار علم باری بجزئیات اور یہ اور انکار حشر جسمانی) کی بنا پر

فارابی اور بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے، چنانچہ حسب مکتوب سعد اللہ خاں علامی بنام علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی وزیراعظم ایران نے ہندوستانی سفارت خانہ کے ملازمین محب علی اور محمد فاروق سے کہا تھا:۔

"امام غزالی در مسئلۂ قدم عالم ونفی علم واجب تعالی شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جلا مرکبا)
بجزئیات اوربہ ونفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی وشیخ ابوعلی سینا نمودہ"
(تذکرہ باغستان امام الدین ریاضی ورق ۶۸)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے ان دونوں کی براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تکفیر کی ہے، انھوں نے پہلے تو یہ کہا کہ یونانی فلسفہ کا ممثل اعظم ارسطو ہے، اور ارسطو کے قابل اعتنا شارح اور ترجمان ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا ہیں اور یہ جن مسائل کی ارسطو کی جانب سے تعلیم دیتے ہیں، ان میں یہ مسائل ثلاثہ بھی ہیں چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" میں ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

المسئلۃ الاولیٰ فی ابطال مذہبہم فی ازلیۃ العالم	(۱) ازلیت عالم کا ابطال۔
المسئلۃ الثانیۃ فی ابطال مذہبہم فی ابدیۃ العالم	(۲) ابدیت عالم کا ابطال
الثالثۃ عشرۃ فی ابطال قولہم ان اللہ لا یعلم الجزئیات	(۱۳) فلاسفہ کے اس قول کا ابطال کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کو نہیں جانتا۔
العشرون فی ابطال انکارھم البعث وحشر الاجساد	(۲۰) فلاسفہ جو حشر اجساد کے منکر ہیں، انکا ابطال

اور یہ تینوں مسائل متفقہ طور پر کفر صریح ہیں، اسلیے انکے قائلین (فارابی اور ابن سینا) واجب التکفیر ہیں، امام صاحب نے ان دونوں کی کتابوں کے مصرح طور پر حوالے نہیں دیے ہیں، مگر انکی تصانیف کے مطالعہ کے بعد واضح ہوجاتا ہے کہ امام غزالی کی یہ گرفت غلط نہیں تھی۔

(معارف: جولائی ۱۹۶۸ء)

۳

تہافت الفلاسفہ کے بعد "تہافت الفلاسفہ" کی اشاعت سے فلاسفہ کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی، شیخ بو علی سینا اور اس کے پیشروؤں نے فلسفہ کی جو فلک بوس عمارت قائم کی تھی، امام غزالی کے رد اور اعتراضات کے بعد ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گئی، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے "غزالی" ہی جیسا عبقری وقت درکار تھا، مگر وہ "فلسفیانہ عبقریت" جو کندی سے شروع ہوئی تھی اور بو علی سینا کے یہاں اپنے شباب کو پہنچی، اب اپنے دن ختم کر چکی تھی، پھر فلاسفہ معاشرہ میں اس درجہ مطعون و مبغوض ہو گئے کہ وہ کھل کر اپنے فلسفی ہونے کا اعلان بھی نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ عمر خیام جو امام غزالی کا ہم عصر تھا، اپنے فلسفیانہ رجحانات کی بنا پر آزادی کے ساتھ گھر سے بھی نکل نہیں سکتا تھا، ابن القفطی نے "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں لکھا ہے:۔

"اور جب اس کے معاصرین نے اس کے دین و مذہب پر اعتراضات کیے اور اس کے معتقدات کو جنہیں وہ چھپاتا تھا، بے نقاب کیا تو اسے اپنی جان کا خوف ہوا اور اپنی زبان اور قلم

Marfat.com

کو روک لیا اور حج کے لیے چلا گیا..... اور جب بغداد پہنچا اور اس کے ہم مسلک اس سے ملنے آئے تو اس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔"

یہ مشرق کی کیفیت تھی، مغرب (اندلس) کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ تفلسف کے الزام میں ابن رشد اور اس کے پیشروؤں کو جن شدائد کا سامنا کرنا پڑا، تاریخ کے صفحات اس کے شاہد ہیں، پھر بھی ابن رشد نے ہمت نہ ہاری اور یونانی فلسفہ کی سر بفلک عمارت کو جسے امام غزالی کے شدید حملوں نے ہلا کر رکھ دیا تھا، اپنی سعی پیہم اور زور استدلال سے گرنے سے بچا لیا، اور امام غزالی کے اعتراضات کا دو بدو جواب دیا، اس کا کہنا تھا کہ امام صاحب کے اعتراضات منطقی و برہانی نہیں ہیں، بلکہ محض اقناعی ہیں، چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے رد میں "تہافت التہافت" کے عنوان سے اس نے جو کتاب لکھی ہے، اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

ان الغرض فی ھذا القول ان نبین مراتب الاقاویل المثبتۃ فی کتاب التہافت فی التصدیق والاقناع وقصور اکثرھا عن رتبۃ الیقین والبرھان۔ (تہافت التہافت لابن رشد، ص ۲)	اس کتاب میں ہماری غرض یہ ہے کہ ان اقوال کے مراتب کو جو امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ میں ثابت کیے گئے ہیں، باعتبار تصدیق واقناع کے بیان کریں اور یہ بتائیں کہ ان میں سے اکثر یقین و برہان کے درجہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

اس کے بعد اس نے امام غزالی کی ایک ایک بات کو لیا، خواہ وہ فلاسفہ پر اعتراض ہو یا فلاسفہ کے اعتراض کا جواب اور اسے باطل کرنے کی کوشش کی، اس طرح فلسفہ کو عہد پیری میں بھی ایک جوان ہمت مددگار مل گیا جس نے ارسطاطالیسی فلسفہ کی نشاۃ ثانیہ کا فریضہ انجام دیا۔ ظاہر ہے اس کتاب کی اشاعت سے فلاسفہ کو کس قدر مسرت ہوئی ہو گی اور متکلمین کو کس قدر

Marfat.com

عدم پہنچا ہوگا۔ ادھر ملک کے سیاسی حالات میں انتشار برپا تھا، تاتاریوں کی غارتگری کچھ دن بعد شروع ہوگئی، انھیں اسلام کی حمایت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس سے اسلام دشمن قوتوں بالخصوص فلسفہ کو بڑی شہ ملی اور اس تصادمِ افکار و آراء نے بڑی شدید شکل اختیار کرلی،

مغرب میں تو ابن رشد کے بعد اس پایہ کا کوئی فلسفی پیدا نہیں ہوا، مگر مشرق میں صورت حال مختلف تھی، یہاں زوال بغداد کے بعد بڑے عظیم المرتبت اور جلیل القدر مفکر پیدا ہوئے جو بیک وقت فلسفی اور متکلم تھے، اس لیے دونوں راستوں کے نشیب و فراز سے واقف تھے، جیسے محقق نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، نجم الدین کاتبی، اثیر الدین ابہری، سراج الدین ارموی، شمس الدین خسروشاہی، رفیع الدین جیلی، قطب الدین رازی، شمس الدین مبارک شاہ وغیرہم۔ ان کے علاوہ یہودی مفکرین نے بھی اس نزاع میں فلاسفہ کی اعانت کی۔ ان میں ابن کمونا خاص طور سے مشہور ہے۔

اس کے نتیجہ میں فلسفہ اور کلام کی نزاع جو ایک حد تک امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" اور ابن رشد کے "تہافت التہافت" کی جنگ تھی، بڑے زور شور سے چلتی رہی حتی کہ تاتاریوں کے قبولِ اسلام، ان کی حکومت کے اختتام اور ان کی جگہ راسخ العقیدہ مسلمان فرمانرواؤں کی سلطنت کے قیام کے زمانہ میں بھی اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، مگر اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ اس قیل و قال سے اسلام کی فکری ثروت میں بیش بہا اضافے ہوتے رہے۔

تہافتین پر محاکمہ | جس زمانہ میں تاتاری لشکروں کی چیرہ دستی سے عالم اسلام میں قیامت صغریٰ برپا تھی، اسی زمانہ میں ایشیائے روم کے اندر عثمانی سلطنت کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس حکومت نے قلیل عرصہ میں دنیا کی عظیم الشان مملکتوں میں نمایاں مقام پیدا کرلیا، اس سلطنت کا سب سے عظیم تاجدار سلطان محمد فاتح تھا، جو تاریخ میں فتح قسطنطنیہ کے لیے مشہور ہے، سیاسی عظمت

Marfat.com

کیساتھ ساتھ اس کا عہد ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کی سرپرستی کے لیے بھی مشہور ہے، یہی زمانہ ترکی میں علم کلام کی ترقی کا "عہد زریں" ہے، چنانچہ فتح قسطنطنیہ کے علاوہ سلطان محمد فاتح کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مولیٰ علاء الدین طوسی اور مولا خواجہ زادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے امام غزالیؒ کے "تہافت الفلاسفہ" اور ابن رشد اندلسی کے "تہافت التہافت" کے درمیان محاکمہ کرنے کی فرمائش کی، دونوں فاضلوں نے فرمان سلطانی کی باحسن وجوہ تعمیل کی اور خواجہ زادہ نے چار مہینہ میں اور مولیٰ علاء الدین طوسی نے چھ مہینے میں اپنے اپنے کارنامے بالترتیب تہافت الفلاسفہ" اور "کتاب الذخیرہ" کے نام سے بارگاہ سلطانی میں پیش کیے، قدرشناس سلطان نے دونوں کو دس دس ہزار کا انعام دیا۔

حافظ احمد علی خاں شوق، نے اسی عنوان کے اپنے مضمون شائع شدہ معارف اکتوبر ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا:-

"نہ جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی، چنانچہ اسی کے پس و پیش زمانہ میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام سے لکھا ہے، سلطان محمد خاں دوم نے اپنے دربار کے بڑے فلسفی موحی فواردی (؟) سے انکا محاکمہ لکھوا دیا ہے، جو کتاب الذخیرہ کے نام سے چھپ گئی ہے۔"

(۱) سلاطین کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، دوم میں تو سلطان محمد فاتح نے محض علمی سرپرستی اور علماء کی ہمت افزائی کے لیے "محاکمہ لکھنے کا امتحان لیا تھا، رہا ہندوستان تو شاہجہاں کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر جب سفارت خانہ کے عملہ کی بوالفضولی کے ہاتھوں ہندوستان کا علمی وقار ایرانی فضلاء کے مقابلہ میں کھویا گیا تو بادشاہ (شاہجہاں) کو اس کی بحالی کا خیال پیدا ہوا، اور محض اس کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لیے اس نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

سے یہ رسالہ (الدرۃ الثمینہ) لکھوایا۔

[ملاحظہ ہو مکالمات نظریہ میں سے شمارہ (۳)۔(۱۹)۔ مزید تفصیل الدرۃ الثمینہ کا تاریخی پس منظر" میں آرہی ہے]

(۲) مولی علاء الدین طوسی نے "تہافتین" پر محاکمہ "کتاب الذخیرۃ" کے نام سے عہد شاہجہانی یا پیش نظر رسالہ "الدرۃ الثمینہ" کے "پس و پیش" زمانہ میں نہیں لکھا تھا، بلکہ تقریباً دو سو سال پہلے لکھا تھا۔ "الدرۃ الثمینہ" ۱۰۵۱ھ میں اور "کتاب الذخیرۃ" سلطان محمد فاتح کے زمانہ حکومت ۸۵۵ھ لغایت ۸۸۶ھ میں لکھی گئی۔

(۳) لفظ موحی نوار دی بالکل بے معنی ہے، اصل لفظ مولیٰ علاء الدین طوسی ہے۔

(۴) سلطان محمد فاتح جس کے عہد حکومت میں "کتاب الذخیرۃ" لکھی گئی۔ شاہجہاں کا ہمعصر نہیں تھا، اور نہ اس نے ان کے پاس ادبی یا علمی تحفے تحائف بھیجے تھے۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں سلطان محمد فاتح کو وفات پائے ہوئے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال ہو چکے تھے۔ مگر فاضل مقالہ نویس نے لکھا تھا:-

"قدیم زمانہ میں جہاں سلاطین باہم تحفہ تحائف اور اپنے ملک کی مصنوعات بھیجا کرتے تھے وہاں اپنے دربار کے شعراء کی غزلیں، قصائد و دواوین اور علماء و فضلاء کی تصنیفات و تالیفات بھی بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ جہاں اور سلطان محمد خاں سلطان روم کے درمیان اسی قسم کے تعلقات قائم تھے۔"

اس لیے یہاں فاضل مقالہ نویس سے تسامح ہوا ہے۔

تہافت الفلاسفہ خواجہ زادہ اور کتاب الذخیرہ کا موازنہ	مولیٰ خواجہ زادہ نے پہلے تو اقاویل فلاسفہ کے ابطال و تردید کے باب میں امام غزالی کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا۔

Marfat.com

ان الامام المحقق حجة الاسلام ابا حامد محمد بن محمد الغزالی.... اخترع رسالة عذراء فی ابطال اقاویل الحکماء وسماها تهافت الفلاسفة وبین فیها تناقض عقائدهم وضعف قواعدهم وبطلان معاقدهم. واودع غرائب نکت کانت کامنة تحت الاستار واوضح من بعده طرقاً فجاجاً کانت مختفیة عن الابصار. جزاه الله عنا وعن کافة المسلمین خیر الجزاء فی دار القرار" (تہافت الفلاسفہ خواجہ زادہ علی حاشیہ تہافت الفلاسفہ للامام الغزالی مطبوعہ مصر ص ۳-۴)

امام محقق حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی نے..... اقاویل حکماء کے ابطال میں ایک اچھوتا رسالہ لکھا ہے جس کا نام تہافت الفلاسفہ رکھا تھا، اور اس میں ان کے عقائد کے اندرونی تضادات وتناقضات، ان کے اصول وقواعد کی کمزوری اور ان کے معاقد ومواقف کے بطلان کا بیان ہے اور عجیب عجیب نکات کو جو پردوں کے نیچے پوشیدہ تھے، اس رسالہ میں ودیعت کیا۔ اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایسے طریقوں کو واضح کیا جو نظروں سے اوجھل تھے، اللہ تعالیٰ انہیں ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے۔

اس کے بعد سلطان محمد فاتح کی فرمائش کا ذکر کیا ہے:-

ثم انی امرت من جناب.... السلطان.... ابو الفتح محمد خان..... بان املی کتاباً علی منوالها...... فبادرت الی مقتضی الاشارة وامتثلت بواجب الطاعة (تہافت الفلاسفہ خواجہ زادہ علی حاشیہ تہافت الفلاسفہ للامام الغزالی مصر ص ۴)

مجھے..... سلطان ابو الفتح محمد خان..... کی جانب سے حکم دیا گیا.... کہ تہافت الفلاسفہ امام غزالی کے انداز پر ایک کتاب لکھوں، پس میں نے حکم سلطانی کی تعمیل وبجا آوری میں جلدی کی

اس کے بعد انھوں نے مجوزہ کتاب کے مقصد، تالیف اور موضوع کی یہ وضاحت کی کہ ہم فلسفہ طبیعیات و الٰہیات کے ان اصولوں کو باطل کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں:

"فنريد ان نحكي في هذه الرسالة من قواعدهم الطبيعية والالٰهية ما اوردها الامام حجة الاسلام مع بعض آخر مما لم يوردها بادلتها المعول عليها عندهم على وجهها ثم نبطلها ارغاماً للمتفلسفة المبطلين واعظاماً لاهل الحق واليقين"

(تہافت الفلاسفہ خواجہ زادہ جلد اول صفحہ، حاشیہ)

ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس رسالہ میں طبیعیات والٰہیات کے اندر جو فلاسفہ کے اصول و قواعد ہیں اور جنھیں امام غزالی نے بیان کیا ہے اور اسکے ساتھ کچھ اور باتوں کو بھی جن کا امام صاحب نے ذکر نہیں کیا تھا، بیان کریں، نیز ان دلائل و براہین کا جن پر فلاسفہ نے تکیہ کیا ہے، اعادہ کریں۔ بعد ازاں باطل پرست فلاسفہ کے خلاف اور اہل اسلام کے ترفع کی صحت اور انکے مسلک کی تعظیم و اجلال کے لیے ہم اہل فلسفہ کے قواعد کی تردید کریں۔

غرض مولی خواجہ زادہ نے یہ کتاب فلسفہ کی تردید و ابطال ہی کے مقصد سے لکھی تھی لیکن انکے حریف مولی علاء الدین طوسی نے یہ کاوش محض احقاق حق کے لیے کی تھی، چنانچہ مقدمۂ کتاب میں فرماتے ہیں:

"كان برهة من الزمان يتلجلج في صدري ويتخالج في قلبي ان اكتب في المسائل الالٰهية وما يتعلق بها لبعض ما تقرر لي وتحقق عندي..... ولكنه يعوقني من ذلك عدوان زماني..... الى ان"

عرصہ سے میرے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ مسائل الٰہیہ اور انکے متعلقات کے بارے میں اپنی تحقیقات قلمبند کروں..... لیکن زمانہ کی ناسازگاری اس خواہش کے بروئے کار لانے میں مانع رہی...... تاآنکہ سلطان

Marfat.com

اشار الی .... السلطان ابو الفتح محمد	ابو الفتح محمد خاں نے مجھے اشارہ کیا .....
بن مراد خاں ان انظر فی الرسالة	کہ میں امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے رسالہ
المسماة بالتہافت الفلاسفة التی	تہافت الفلاسفہ کا مطالعہ کرکے اسکے انداز
الفہا الامام .... الغزالی رحمۃ اللہ	پر متکلمین و فلاسفہ نیز انکے مناہج کے باب میں
تعالیٰ علیہ .... واکتب علی اسلوبہ	جو کچھ میری رائے ہو، اسے تحریر کروں اور
ما یسنح لی ویظہر عندی فی کلام	فریقین کے دلائل و براہین کی کمزوری اور
الفریقین وقواعد الطریقین من	ترجیح اور ان کے صحیح اور باطل ہونے
جہات التضعیف والترجیح و	کے متعلق اپنی تحقیق ثبت کروں۔
الابطال والتصحیح (کتاب الذخیرہ ص۲)	

اور "کتاب الذخیرہ" کے مطالعہ سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ انھوں نے احقاق حق بھی صحت نقل و حکایت میں دونوں فریقوں (حکماء و متکلمین) کے دلائل و براہین پوری غیر جانبداری کے ساتھ رقم کرنے میں پوری احتیاط ملحوظ رکھی ہے۔ وہ خود بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔

وشرطت علی نفسی عند ما شرعت	جب میں نے اس اہم کام کو شروع کیا تو اپنے
فی ھذا الخطب الخطیر والامر	اوپر یہ شرط عائد کرلی کہ میں اس کتاب میں
الکبیر ان لا اکتب الا ما ثبت	صرف وہی بات درج کروں گا جو میرے نزدیک
عندی بالقطع انہ الحق والصواب	قطعی طور پر ثابت ہو کہ وہ حق اور صواب
(کتاب الذخیرہ ص ۴-۵)	ہے۔

اس طرح مولیٰ خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ" اور مولیٰ علاء الدین طوسی کی "کتاب الذخیرہ" نے اس نزاع کو جو امام غزالی کے زمانہ سے چلی آرہی تھی، بڑی خوش اسلوبی سے ختم کیا،

Marfat.com

چنانچہ ابن المؤید آماسی جب خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ" لے کر محقق دوانی (المتوفی ۹۰۸ھ) کے پاس پہنچے تو وہ اسے پڑھ کر بہت زیادہ خوش ہوئے، اور ان الفاظ میں کتاب کی تعریف فرمائی:

رضی اللہ تعالیٰ عنک وعن مؤلفہ	اللہ تعالیٰ تم سے اور مصنف سے راضی ہو
قد کان فی نیتی ان اکتب فی ھذا	کہ تم نے مجھے یہ کتاب دکھا دی، میرا بھی ارادہ
الباب کتاباً ولو کتبت قبل ان اری	اس موضوع پر لکھنے کا تھا۔ اگر اسے دیکھے بغیر
ھذا الکتاب لافتضحت	لکھ ڈالتا تو کیسی بدنامی ہوتی۔

(الشقائق النعمانیہ علی ہامش تاریخ ابن خلکان ـ ۱ ص ۲۱۱)

ایران میں تفلسف کا احیاء

محقق دوانی نے ۹۰۸ھ میں وفات پائی، اس کے اگلے سال ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی، سیاسی انقلابات ہمیشہ اپنی جلو میں فکری انقلابات بھی لے کر آتے ہیں، ایران میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا، صفوی حکومت قوم پرستی کے نام سے وجود میں آئی، مگر قوم پرستی احیائیت کو اور احیائیت "پاستان پرستی" کو پیدا کرتی ہیں، اس لیے ایران میں بھی اس "پاستان پرستی" کا چرچا ہوا اور اس کے نتیجے میں تفلسف کے ساتھ فضلائے عہد کا اعتناء انتہائی حد کو پہنچ گیا، یوں بھی ایران کو قدیم زمانہ سے اپنے فلسفہ وحکمت پر ناز تھا اور وہ خود کو علم وحکمت کا گہوارۂ اولین سمجھتا تھا۔

فلسفہ کے ساتھ اس شغف بے پایاں نے ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کو قومی ہیرو بنا دیا۔ اور ان کی جملہ تعلیمات کو معصوم عن الخطا سمجھ لیا گیا، لیکن امام غزالیؒ نے مسائل ثلثۃ (قدم عالم، انکار علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ اور انکار معاد جسمانی) کی بنا پر ان دونوں کی بالواسطہ تکفیر کی تھی جس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے، اس لیے احیائیت، پاستان پرستی اور تفلسف پسندی کے نتیجہ میں اس زمانہ میں فارابی اور ابن سینا کے مواقف کی تصویب وتصحیح کا ایران میں عام

Marfat.com

رجحان تھا، یوں بھی خود سنجیدہ مفکرین ان مواقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، چنانچہ

الف۔ قدم عالم کے انکار کے سلسلے میں محقق دوانی نے لکھا ہے:۔

"بعض متاخر محدثین قدم جنسی کے قائل ہیں (بایں طور کہ افراد عالم میں سے کوئی نہ کوئی فرد بر سبیل تعاقب و تداول موجود ہے) اور میں نے ابن تیمیہؒ کی کسی کتاب میں عرش کے بارے میں یہ قول دیکھا ہے۔"

پھر "قدم عالم" کا انکار اس اصول پر مبنی تھا کہ اگر کسی شے سے کوئی امر قصداً اختیاری طور پر صادر ہو تو وہ ضرور حادث ہوگا

"اذا الصادر عن الشئ بالقصد والاختیار حادث بالضرورۃ۔"

مگر بعد کے متکلمین نے اس کلیہ کی صحت سے انکار کر دیا۔

اس طرح قدم عالم سے انکار کے قول میں اب وہ پہلی سی سختی نہیں رہی، اور ان اکابر مفکرین نے لچک کے لیے اس میں گنجائش پیدا کر دی۔

اسی طرح باری تعالیٰ کے "عالم جزئیات حادثہ" ہونے نہ ہونے کے بارے میں فلاسفہ کے مواقف کو زیادہ دقت نظر سے سمجھنے کی کوشش کی گئی، اور اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ "علم باری تعالیٰ بجزئیات حادثہ" کے بارے میں شیخ بوعلی سینا نے جو لکھا ہے، اسکی مراد کو پوری سمجھنے میں فراخ دلی سے کام نہیں لیا گیا۔

مگر سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ "حشر اجساد" کا تھا، اس سلسلے میں فارابی کے اقوال کے اندر بہت زیادہ اضطراب ہے، کہیں اس نے اس کا قطعی انکار کیا ہے اور کہیں اقرار۔ یہی حال ابن سینا کا ہے۔

پھر ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کے متبعین کے علاوہ وجدان کے مواقف کو نیک محمل

Marfat.com

پر محمول کرنا چاہتے تھے، دوسرے مفکرین بھی تھے جو نئے نئے تصورات پیش کر رہے تھے، جیسے میر باقر داماد، جنھوں نے "حدوث دہری" کا نظریہ وضع کیا، یا ان کے شاگرد ملا صدرا (جن کی شرح ہدایۃ الحکمہ" آج بھی "صدرا" کے نام سے مدارس عربیہ کے معقولات کے اعلیٰ نصاب میں مشمول ہے) جنھوں نے نفس انسانی کے "جسمانیۃ الحدوث وروحانیۃ البقا" ہونے کا تصور پیش کیا، ملا صدرا کے متاخر پیرووں میں شیخ احمد احسائی نے "معاد" کے سلسلے میں "بدن ہورقلیائی" کے عقیدے کی تجدید کی، جسے شہاب الدین سہروردیؒ مقتول (شیخ الاشراق) نے "مطارحات" میں پیش کیا تھا۔

لیکن زیادہ قیل وقال کا موضوع "فلسفہ کے شیخین" (فارابی اور ابن سینا) ہی کے افکار رہے، اور اہل علم ان ہی کے مواقف کو نیک محمل پر محمول کرنے میں اپنی علمی سرگرمیوں کو منحصر رکھتے تھے، چنانچہ جب کسی فاضل کے علم وفضل کو جانچنا ہوتا تو کہا جاتا کہ مسائل ثلثہ کے بارے میں، جن کے اندر امام غزالی نے فارابی اور بوعلی سینا کے مواقف کی تکفیر کی ہے، حکما کے مسلک کی (جو قدم عالم کے قائل اور معاد جسمانی اور شمول علم باری بجزئیات مادیہ کے منکر تھے) تاویل کرو۔

اسی بنا پر خلیفہ سلطان (وزیر دانشور عراق) نے ہندوستانی فضلا (محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس، جنھیں اپنی معقولات دانی پر ناز تھا) سے کہا تھا:-

"امام غزالی در مسئلہ قدم عالم ونفی علم واجب (تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمین فی حق نفسہم والجاہلون بانہ جہلا مرکبا) بجزئیات مادیہ ونفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی وشیخ بوعلی سینا نمودہ وجمیع تاویل کلام حکما کردہ اند۔ این مراتب را تقریر باید کرد۔"

غرض جن مسائل پران مدعیان علم وفضل سے تقریر کا مطالبہ کیا گیا تھا، تین تھے:

قدم وحدوث عالم، اثبات وانکار حشر اجساد اور شمول وعدم شمول علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ
مگر فاضل مقالہ نویس جنھوں نے اس بحث کے علمی وفکری پس منظر کو زیادہ درخور اعتنا نہیں
سمجھا، انھیں دو ہی مسئلوں میں منحصر کر دیا اور "حشر اجساد" کے مسئلہ کو چھوڑ دیا، حالانکہ اسکی
اہمیت ظاہر ہے:

اس بحث کو ختم کرنے سے پیشتر فاضل مقالہ نگار کی دو اور قیاس آرائیوں پر تنبیہ
مناسب معلوم ہوا۔ آپ ملاحظہ ہو محلات نظریہ میں سے (۵) اور (۶)، فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان سے ترکی ان کتابوں کے پہنچنے کی صورت یہ معلوم ہوئی کہ قدیم زمانہ میں
جہاں سلاطین باہم تحفہ تحائف اپنے ملک کی مصنوعات کا بھیجا کرتے تھے۔ وہاں اپنے دربار
کے شعراء کی غزلیں، قصائد، دواوین اور علماء وفضلاء کی تصنیفات وتالیفات بھی
بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ جہاں اور سلطان محمد خاں سلطان روم کے درمیان اس
قسم کے تعلقات قائم تھے۔ اور اس طرح شاہی تحائف کے ضمن میں ہندوستان
کے اس مایۂ ناز حکیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات ترکی پہنچی ہیں۔"

اوپر تنبیہ ہو چکا ہے کہ ممالک اسلامیہ میں علم وادب کی نشر واشاعت شاہان وقت کے
"ارسال ہدایا وتحف" سے بے نیاز تھی۔ اور اگر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات "شاہی
تحائف کے ضمن میں ترکی پہنچیں" تو ترکی کے علماء کی تصانیف مثلاً "خیالی" کس طرح ہندوستان
آکر داخل درس ہوئیں۔ پھر فاضل مقالہ نگار کو ایک غلط فہمی یہ ہو گئی تھی کہ شاہ جہاں اور
سلطان محمد فاتح (جس کے ایماء سے خواجہ زادہ نے "تہافت الفلاسفہ" اور مولیٰ علاء الدین
طوسی نے "کتاب الذخیرہ" لکھیں) ہم عصر تھے۔ حالانکہ دونوں میں ڈیڑھ سو سال کا
تقدم وتاخر تھا۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ علمی کتابوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اور اہل علم میں مقبول بنانا خود علماء ہی کی کوششوں کی رہین منت تھا، چنانچہ جب فیروز تغلق نے مولانا جلال الدین رومی کو مدرسہ فیروز شاہی کا صدر مدرس مقرر کیا تو انھوں نے اپنے استاد قطب الدین رازی کی شرح شمسیہ کو داخل نصاب کیا، اسی طرح جب اس نے بالا بند سیری کے مدرسہ میں مولانا نجم الدین سمرقندی کو صدر مدرس بنایا تو انھوں نے اپنے ہم وطن شمس الدین سمرقندی کی کتاب "الصحائف فی علم الکلام" داخل درس کیا اور یہ دونوں کتابیں دسویں صدی کے آغاز تک جبکہ مولانا عبد اللہ تلبنی اور شیخ عزیز اللہ ملتانی نے معقولات کی کتابیں لاکر داخل درس کیں، منطق و فلسفہ کے اعلیٰ نصاب کی آخری کتابیں سمجھی جاتی تھیں۔

طاش کبریٰ زادہ نے لکھا ہے کہ جب مولی ابن المؤید آماسی ترکی سے ایران گئے اور محقق دوانی کی خدمت میں پہنچے تو موخر الذکر نے دریافت کیا، ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو اس پر انھوں نے مولیٰ خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ" ان کی خدمت میں پیش کی جسے مطالعہ کرنے کے بعد وہ بہت زیادہ محظوظ ہوئے، فرماتے ہیں:-

وسمعت عن ثقة ان المولی	میں نے ایک قابل اعتماد شخص سے سنا کر
ابن المؤید لما وصل الی خدمة	جب مولیٰ ابن المؤید الآماسی محقق دوانی
المولی الدوانی، قال له: بای	کی خدمت میں پہنچے تو محقق نے ان سے
هدية جئت الينا. قال	دریافت کیا، ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟
کتاب التهافت لخواجه زاده	کہا: مولیٰ خواجہ زادہ کی تہافت الفلاسفہ۔
...... قال قد فعت اليه	...... مولی ابن المؤید کہتے ہیں کہ میں نے
الکتاب المذکور فطالعه مدة	کتاب مذکورہ انھیں جس کا انھوں نے
(الشقائق النعمانیہ برحاشیہ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۱)	عرصہ تک مطالعہ کیا۔

Marfat.com

اس کے بعد جو ان کا اثر تھا، وہ اس سے پہلے نقل ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحسین و آفرین کے بعد یہ کتاب ایران میں کس درجہ مقبول ہوئی ہوگی۔

اسی طرح جب دسویں صدی کے آخر میں امیر فتح اللہ شیرازی اکبر کی طلب پر ہندوستان آئے تو انھوں نے محقق دوانی اور دوسرے اکابر علمائے ولایت (ایران و ماوراء النہر) کی مصنفات کو لاکر یہاں مقبول کرایا اور اس کے بعد ان کتابوں کی تعلیم و تدریس کا عام رواج ہوگیا، چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں امیر فتح اللہ شیرازی کے تذکرے میں لکھا ہے:۔

تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان، میر بہندوستان آورد۔ و در حلقہ درس انداخت۔ و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند۔ و از اں عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد۔"

(مآثر الکرام ص ۲۳۸)

(معارف: اگست ۱۹۶۸ء)

Marfat.com

(ج) الدرۃ الثمینۃ کی وجہِ تصنیف و سنہ تصنیف

[دیکھیے محلات نظر میں سے ۱/۳،۱/۷،۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۵،۱۶]

تصنیف | احمد علی خاں شوق نے کتب خانہ رامپور کے مخطوطہ نمبر ۳۱ فن کلام عربی کے بارے میں لکھا ہے:-

"خط مولویانہ شکستہ آمیز صفحات ۲۷ سنہ ۱۰۵۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔"

آگے چل کر لکھا ہے:-

"ملا صاحب کا انتقال ۱۰۶۱ھ یا ۱۰۶۲ھ میں ہوا ہے، اس لیے یہ رسالہ انکی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے۔"

مگر ۱۰۵۷ھ پیش نظر مخطوطہ کا سالِ کتابت نہیں ہے، بلکہ خود متن "الدرۃ الثمینۃ" کا سالِ تصنیف ہے، جیسا کہ خود مصنف علام نے رسالہ کے آخر میں تصریح کی ہے:-

Marfat.com

"ولیکن ھذا آخر ما اردنا ایرادہ فی ھذہ الرسالۃ الخاقانیۃ حامداً
للہ تعالیٰ ومصلیاً علی نبیہ وآلہ۔ شارعاً فی تحریرہ صحوۃ یوم الجمعۃ
خامس شھر ربیع الثانی متمماً فی آخر یوم الجمعۃ ثانی عشر منہ من ۱۰۵۰ھ"۔

بظاہر یہ کاتب کا ترقیمہ نہیں ہے، بلکہ خود مصنف کی تصریح ہے، کیونکہ کاتب کا کام محض تحریر و کتابت تھا، "ایراد" (بیان) سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، اسے یہ کہنے کا کوئی حق نہ تھا کہ "ولیکن ھذا آخر ما اردنا ایرادہ فی ھذہ الرسالۃ الخاقانیۃ"

وجہ تصنیف مصنف کی اس غیر مبہم تصریح کے علاوہ رسالہ کی ترتیب و تحریر کا تاریخی پس منظر بھی اس بات کا شاہد ہے کہ یہ رسالہ ۱۰۵۰ھ (ماہ ربیع الثانی) میں لکھا گیا تھا، اس کے لیے ہند و یران کے روابط پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مستحسن ہوگا۔

ہند و ایران کے روابط سیاسیہ کی تجدید دسویں صدی ہجری نئے سیاسی انقلابات لیکر آئی۔ ایران و وسط ایشیا میں تیموری خاندان کا اقتدار ختم ہو رہا تھا، آق قیونلو اور قراقیونلو ترکمانوں کے ہاتھوں، نیز برادرانہ خانہ جنگیوں کے نتیجے میں اب اس خاندان کی شوکت و عظمت ایک بھولی بسری داستان بن رہی تھی، خانوادۂ تیموریہ کا آخری قابل ذکر تاجدار سلطان حسین مرزا ۹۱۱ھ میں انتقال کر گیا، دوسرا شاہزادہ ظہیر الدین محمد بابر تھا، اس نے بھی بار بار آبائی سلطنت سمرقند کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر ہر مرتبہ ناکامی ہوئی۔ اور آخر وطن مالوف سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور پہلے کابل میں پھر ہندوستان میں لودی سلاطین کے اقتدار کو ختم کر کے مغل سلطنت قائم کی جو ۹۳۳ھ سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) تک قائم رہی۔

اُدھر ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۹۰۶ھ میں وہاں کے ترکمان خاندانوں کو ختم کر کے صفوی خاندان کی قومی حکومت قائم کی۔

Marfat.com

اس طرح ترکمان صفویوں اور مغلوں کے مشترک دشمن تھے، اور ان کے استیصال و بیخکنی کے مشترک جذبے نے دونوں میں سیاسی اور ڈپلومیٹک روابط کی تجدید کی، چنانچہ ۹۱۷ھ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کے سپہ سالار اعظم نجم ثانی اور بابر کی متحدہ فوجوں نے اوزبکوں پر حملہ کیا۔ قلعہ غجدوان کے نیچے زبردست جنگ ہوئی جس میں امیر نجم ثانی مارا گیا، اور بابر بنیل مرام کابل کی طرف چلا گیا، مگر "میانِ خلوص و وداد" کا دونوں خاندانوں میں آغاز ہوگیا۔

بابر کے بعد ہمایوں اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے بعد شاہ طہماسپ ہندوستان اور ایران میں تخت نشین ہوئے، ہمایوں ۹۴۹ھ میں شیر شاہ کے ہاتھوں ہندوستان سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور شاہ طہماسپ کے پاس جاکر پناہ لی، اس طرح یہ روابط اور مستحکم ہوگئے۔

ہمایوں نے ۹۶۲ھ میں پھر شیر شاہ کے جانشینوں سے کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرلی، مگر اگلے سال ہی وفات پاگیا، اس کے بعد اکبر تخت نشین ہوا، صفوی خاندان میں اس کا معاصر شاہ عباس (اول) تھا جو اپنی عظمت و شوکت کی بنا پر شاہ عباس اعظم کہلاتا ہے، دونوں تاجداروں میں غیر معمولی محبت و خلوص تھا، اور مخلصانہ خط و کتابت بھی تھی، چنانچہ "دفتر ابوالفضل" میں متعدد خطوط اکبر کی جانب سے شاہ عباس اعظم کو لکھے ہوئے ملتے ہیں،

اکبر کا بیٹا جہانگیر تھا جو اس کے بعد اس کا جانشین ہوا، اس کے اور شاہ عباس اعظم کے درمیان بھی بڑی محبت تھی،

غرض شاہ اسمٰعیل صفوی سے لیکر شاہ عباس اعظم تک مغل خاندان اور صفوی تاجداروں میں بڑے مخلصانہ تعلقات قائم رہے، چنانچہ شاہ جہاں نے شاہ عباس ثانی کو اپنے پہلے خط میں تحریر کیا تھا،

"پیوستہ میان خواقین ایں دودمان سلاطین نشان (تاجداران خاندان مغلیہ) و فرمانروایان سلسلہ صفویہ ابواب اتحاد و وداد مفتوح بود"۔ (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد دوم ص ۹۳)

Marfat.com

کشیدگی اور اس کا اندمال | شاہ عباس اعظم کی وفات پر اس کا بیٹا شاہ صفی تخت نشین ہوا، وہ بڑا ظالم اور درشت خو تھا، اس کی تفصیل ایران کی تاریخوں میں مذکور ہے، اسی درشت خوئی کے نتیجہ میں دونوں تاجداروں شاہ صفی اور جہانگیر میں ان بن ہوگئی، قندھار پر دونوں قبضہ کرنا چاہتے تھے، معاملہ لڑائی تک پہنچا جس کی تفصیل عہد جہانگیری کی سیاسی تاریخوں میں مذکور ہے، اسکے نتیجہ میں دونوں حکومتوں کے درمیان تعلقات منقطع ہوگئے،

جہانگیر کا آخری زمانہ بڑی بےچینی میں گذرا، اس کی وفات پر شاہ جہاں تخت نشین ہوا، مگر اس کی تخت نشینی بھی پرسکون حالات میں ظہور پذیر نہیں ہوئی، اس لیے داخلی فتنوں اور متوقع خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ بیرونی طاقتوں سے زور آزمائی، تدبر و مصلحت اندیشی سے خالی تھی، اُدھر درشت خو شاہ صفی کا بھی انتقال ہوچکا تھا اور اس کا جانشین شاہ عباس ثانی زیادہ بد خو نہ تھا، اس لیے نئے مغل تاجدار شاہجہاں نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ نئے صفوی حکمران (شاہ عباس ثانی) کے ساتھ محبت و وداد کی رسم قدیم کی تجدید کی جائے، چنانچہ اس نے ایک کاروان امیر جاں نثار خاں کو دربار ایران میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ موجودہ کشیدگی کو دور کرکے دونوں حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بحال کرسکے ۱۰۵۶ھ میں اس سفارت کو ایران روانہ کیا گیا، عبد الحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں لکھا ہے:

"و ہژدہم ایں ماہ (صفر ۱۰۵۶ھ) اورا (جان نثار خاں را) بخلعت و جمدھر و باما فتہ پانصدی ذات و دو ہزاری پانصد سوار .... سرفراز ساختہ دستوری دادند و .... مصحوب او گرامی مراسلہ مبنی از مراسم تعزیت و مبنی از لوازم تہنیت کہ علامی سعد اللہ خاں بامراعلیٰ انشا نمودہ، مائۂ مرصع آلات و پنج ہزار پارچہ .... برسم ارمغان ارسال فرمودند" (بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۹۳)

Marfat.com

خوش قسمتی سے عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس خط کو من وعن نقل کیا ہے :-

"چوں پیوستہ میان خواقین این دودمان سلاطین نشان (خاندان مغلیہ) و فرمانروایان سلسلۂ صفویہ ابواب اتحاد و وداد مفتوح بود ...... ہر چند شاہ صفی در اواخر ایام سلطنت از قلت تجربہ و دیگر موجبات غفلت و غرور مصدر بعضے اندیشہائے بیجا و نگالشہائے ناسزا کہ باعث رنجیدن بل رنجانیدن باشد، گشت ۔ اورنگ آرائے جہانبانی (شاہ جہاں) ...... بعد از ارتحال شاہ مذکور نہ پسندیدند کہ سلسلہ مصافات و رابطۂ موالات کہ از دیر باز موکد است، یکبارہ گسیختہ شود ۔ بنا برآں مقرر ساختند کہ جان نثار خاں را کہ از خانہ زادان آداب دان مزاج شناس است، بتعزیت شاہ صفی و تہنیت پسر او کہ بنام جوش شاہ عباس مسمی است بفرستند"۔ (ایضاً)

جان نثار خاں بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ روانہ ہوا اور ابھی وہ فراہ پہنچا تھا کہ ایک دوسرا قاصد آکر اس سے ملا، یہ میر عزیز تھا، جسے شاہ جہاں نے ایک خط دیکر اُزبک تاجدار نذر محمد خاں کے پاس اسی سال ۸ رجب کو بھیجا تھا، چنانچہ عبدالحمید لکھتا ہے:

"میر عزیز ...... را ...... ہشتم این ماہ (رجب ۱۰۵۲ھ) پیش والی (نذر محمد خان) فرستادند ...... میر عزیز باستعجال تمام راہی گشتہ و از سوئے فراہ بجان نثار خان پیوستہ، بہ تبلیغ قضا تعاذ کہ از پیشگاہ عنایت بخان مزبور ارسال یافتہ بود، رسانید"۔ (ایضاً صفحہ ۵۷۲-۵۷۶)

میر عزیز کو حکم تھا کہ جتنا بھی جلد ہو سکے اس خط کو نذر محمد خاں والی بلخ تک پہنچا دے اس لیے وہ جان نثار خاں کو سکون و اطمینان کے ساتھ طے منازل کرتا ہوا چھوڑ کر

Marfat.com

باد و باراں کی رفتار سے مملکت صفویہ کے پایہ تخت اصفہان پہنچا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پیشتر ہی نذر محمد خاں اصفہان سے خراسان کی طرف جا چکا تھا، میر عزیز چاہتا تھا کہ فوراً اس کی تلاش میں خراسان روانہ ہو جائے۔ مگر شاہ عباس ثانی نے مشورہ دیا کہ وہیں ایران میں ۱۰ ذی الحجہ تک قیام کرے۔ اس عرصہ میں جان نثار خاں بھی آ جائیگا اور عید الاضحیٰ کے دن صفوی دربار میں باریاب ہوگا۔ شاہ عباس کا مشورہ عبد الحمید نے اس طرح نقل کیا ہے:

"اولیٰ آنکہ چوں آمدن جان نثار خاں نزدیک است، چندے توقف نمودہ عید الاضحیٰ کہ ساعت ملازمت او مقرر ساختہ ایم ہمراہ او بار یابند"۔ (ایضاً ص ۵۸۶)

اس کی تفصیل تو نہیں ملتی کہ جان نثار خاں دار السلطنت اصفہان میں کب پہنچا (غرہ رجب اور ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کے درمیان ضرور پہنچا ہوگا) مگر اتنا یقینی ہے کہ صفوی دربار میں اس کی باریابی پہلی مرتبہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کو ہوئی۔

جس وقت سے جان نثار خاں اصفہان پہنچا، اُس وقت سے ۱۰ ذی الحجہ تک کا سارا وقت سیاسی نوعیت کی ملاقاتوں میں گذرا ہوگا، خواہ یہ ملاقاتیں وزیر اعظم سے ہوئی ہوں یا دیگر امرائے دربار سے اور نہ صرف جان نثار خاں، بلکہ سفارت کا پورا عملہ خوش گوار تعلقات کی بحالی میں مصروف رہا ہوگا اور اس عرصہ میں ثقافتی تفریحات کا موقعہ شاید ہی مل سکا ہو،

ثقافتی مشاغل کا آغاز | غالباً جان نثار خاں اپنی کاروانی و طلاقت لسانی سے کار مفوضہ کی انجام دہی میں کامیاب ہوا، اور صفوی اور مغل خاندان کی کشیدگی دور ہو کر خوشگوار تعلقات پھر سے بحال ہو گئے،

اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایرانی دربار کے وجوہ و اعیان اور

ہندوستانی سفارت خانہ کے علما کے درمیان علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا، ہندوستانی سفارت خانہ کے علما نے آدابِ مناظرہ میں اپنی دستگاہ عالی اور طلاقت لسانی سے ایرانیوں کے مقابلہ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں وزیر اعظم کی مجلس میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔

ہندوستانی سفارت خانہ کے علما میں دو شخصوں کو اپنی معقولات دانی پر ناز تھا، ان میں سے ایک سفارت خانہ کا مشرف محمد فاروق تھا، اور دوسرا وقائع نویس محب علی۔ اُدھر وزیر اعظم ایران حکمت و معقولات کا فاضل متبحر تھا، ایران ہمیشہ سے فلسفہ و حکمت کا گہوارہ رہا ہے، اور ان علوم کے ماہرین کو وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر صفوی عہد میں امور کیا جاتا تھا، چنانچہ علامی سعد اللہ خاں نے اپنے مکتوب میں جسے انھوں نے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کو بھیجا تھا، لکھا تھا:-

"خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است"۔

وزیر اعظم نے جس کا لقب "خلیفہ سلطان" ہوا کرتا تھا، جیسا کہ عبد الحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" (جلد دوم صفحہ ۶۵۹) میں لکھا ہے:-

"خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ کہ لقب وزیر فرمانروائے ایران است"۔

اس نے ان مدعیانِ علم و فضل کے مبلغ علم کا اندازہ لگا لیا، ہندوستانیوں کا علم بحالی تک محدود تھا، علمی نکات سے ان کو بہت کم واسطہ تھا، اس لیے اس نے منطق و فلسفہ کے مسائل میں مناظرہ کرنے کے بجائے ان لوگوں سے امتحاناً کہا کہ امام غزالی نے ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کی مسائل ثلثہ [قدم عالم، انکار حشر اجساد اور انکار علم باری بجزئیات] کے قول کی بنا پر تکفیر کی ہے، مگر بعض اہل علم نے حکما کے قول کو نیک محمل پر محمول کیا ہے، اس

تاویل کی تقریر کیجیے۔

ہندوستانی فضلا، تاریخی حقائق سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے "سوال از آسمان جواب از ریسمان" کے مصداق اپنی ناواقفیت کو لفاظی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی، مگر ان کا جہل مرکب اہل نظر سے مخفی نہ رہ سکا، اور ہندوستانی فضل و کمال کی دیارِ غیر میں بڑی ہوا خیزی ہوئی۔

اسی واقعہ کا علامی سعد اللہ خاں نے اپنے خط میں جو انھوں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو لکھا تھا، ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"افادت پناہ، افاضت دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ با امارت مآب جان نثار خاں سفیر متعین اند، پس از دعوات ایشاں بفضل و کمال پرسید کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم ونفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جلاً مرکباً، بجزئیات مادیہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ ابوعلی سینا نمودہ۔ وجہے تاویل کلام حکما، کردہ اند۔ ایں مراتب را تقریر باید کرد۔ مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند و از مسلک معقولیت دور افتادند" [پورا خط معارف بابت ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸ میں نقل ہو چکا ہے]

غرض یہ مناظرہ ۱۰۵۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں ہوا ہوگا، اور یقیناً ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کے بعد کیونکہ اس وقت تک کا سارا زمانہ ہندوستانی سفیر نے سیاسی گفت و شنید میں گزارا ہوگا، اور اس کے بعد ثقافتی تعلقات اس حد تک بڑھانے کے لیے کہ ہندوستانی سفارت خانہ کا عملہ عام ایرانی فضلا، پر اپنے تبحر فی المعقولات کا سکہ بٹھا کر، وزیر اعظم ایران کے ساتھ بے تکلفی

Marfat.com

کے ساتھ علمی مباحثہ کرسکے، دو تین مہینہ ضرور لگے ہوں گے، لہذا یہ آسانی تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ یہ مناظرہ صفر یا ربیع الاول ۱۰۵۰ھ میں ہوا ہوگا،

اس کے بعد پرچہ نویس نے اس ہوا خیزی کی اطلاع بادشاہ کو دی ہوگی، جو آخر ربیع الاول میں اس کے گوش گزار ہوئی ہوگی۔ اس وقت بادشاہ کابل میں تھے کیونکہ وہ آخر صفر ۱۰۵۰ھ میں لاہور سے روانہ ہوئے، جیسا کہ عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے:-

"و بنفس نفیس ہژدہم ماہ صفر (۱۰۵۰ھ) بعد از دو پہر و چار گری روز بساعتے کہ توانی کنہ بد و تقویم از دار السلطنۃ لاہور بصوب دار الملک کابل نہضت فرمودند"

(بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۱۳۸)

اور ربیع الاول کی آخری تاریخ کو کابل پہنچے

"سلخ ربیع الاول بساعت مختار نزہت گاہ کابل بنور ماہچہ اعلام ضیاء وسنا پذیرفت"

بہرحال اس واقعہ (ہندستانی مدعیان علم و فضل کی ہوا خیزی) کی خبر بادشاہ کو پہنچی، اس خبر سے اس کا رنجیدہ ہونا فطری تھا، مزاج شناس وزیر (علامی سعد اللہ خاں) نے نگاہوں کو پہچان لیا اور فوراً ہی بادشاہ سلامت کی گرانیٔ مزاج کو دور کرنے کے لیے تدبیر سوچ لی، اس اہم کام کی انجام دہی کے لیے ان کی نگاہ انتخاب نے افاضل دربار اور عباقرۂ ملک میں سے ایک شخص کو چن لیا یعنی ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کی ذات گرامی تھی، اور بادشاہ کے استمزاج کے بعد ان کو خط لکھا جو کسی پچھلی قسط میں (معارف ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۰۷-۲۰۸) نقل ہو چکا ہے،

علامی سعد اللہ خاں کا یہ خط غالباً ربیع الثانی ۱۰۵۰ھ کی شروع کی تاریخوں میں ملا سیالکوٹی کو پہنچا، انھوں نے اولین فرصت میں اس کی تعمیل شروع کردی، ربیع الثانی کا پہلا جمعہ ۵ر تاریخ کو پڑا، اسی مبارک دن سے انھوں نے مطلوبہ رسالہ تصنیف کرنا شروع کیا،

Marfat.com

اور گو کہ علامی سعد اللہ خاں نے اس کارِ خطیر کی انجام دہی کے لیے دس پندرہ روز (دہ پانزدہ روز) کا وقت دیا تھا، مگر انھوں نے ایک ہفتہ میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، ایک ساعتِ سعید [جمعہ کے دن] سے شروع کیا اور دوسری ساعتِ سعید [اگلے جمعہ] کو ختم کر دیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

"شارعاً فی تحریرہ ضحوۃ یوم الجمعۃ خامس شہر ربیع الثانی متماً فی آخر یوم الجمعۃ ثانی عشر منہ من ۱۰۵۵ھ"

○

احمد علی خاں شوق

"عراق میں جان نثار خاں شاہجہاں کی طرف سے کسی خدمت پر مامور تھا محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس اس کے ہمراہ تھے۔"

انھوں نے اس "کسی خدمت" کی توضیح نہیں کی، مگر اوپر کی تفصیل اور "بادشاہ نامہ" کی تصریح سے واضح ہے کہ وہ ۱۰۵۶ھ میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا اور یہ دونوں حضرات (محمد فاروق اور محب علی) سفارت خانہ کے عملہ میں اہم خدمات پر مامور تھے، خود علامی سعد اللہ خاں نے جان نثار خاں کی "سفارت" کی تصریح کی تھی، پھر انکے نام سے پہلے امارت مآب کا خطاب بالکل ایسا ہی ہے جیسے آج کل سفرا کے نام سے پہلے

Marfat.com

"Excellency دزیر" کا خطاب لگا ہوتا ہے، بہر حال سعد اللہ کے الفاظ قابل غور ہیں :-

"محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ بالارت آب جان نثار خاں سفیر متعین اند" (ملاحظہ ہو معارف ستمبر ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۷)

شوق نے لکھا ہے :-

"سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین خلیفہ سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہو گیا تھا۔ پھر وہ ہندوستان چلا آیا، شاہجہانی تاریخوں میں اس کا ذکر مسند و مقامات میں ہے، یہ لائق اور صاحب علم امیر تھا اور وزیر دانشور عراق کے نام سے مشہور تھا" (دیکھئے محلات نظریں سے نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱)

مگر یہ تمام باتیں محل نظر ہیں :-

(الف) خلیفہ سلطان "سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین" نہیں تھا۔

(ب) نہ وہ "ایران سے نکل کر عراق میں آباد" ہوا، اور

(ج) نہ وہ "پھر ہندوستان چلا آیا"۔

الف - یہ فاضل مدبر اور وزیر دانشور (خلیفہ سلطان) مازندران کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ تھا، جب شاہ عباس ثانی نے مازندران کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا، تو کچھ تو تالیف قلب کے لیے اور کچھ اس باکمال کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اسکے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اسے قلمدان وزارت سونپ دیا، چنانچہ خافی خاں نے انکے بھائی مرزا قوام الدین کے سلسلے میں لکھا ہے :

"مرزا قوام الدین کہ از برادران خلیفہ سلطان واز سلسلۂ پادشاہزادہ ہائے مازندران بود"

Marfat.com

بعد ؛ کہ مازندران بتسخیر شاہ ایران درآمد، شاہ عباس با خلیفہ سلطان نسبت نمودہ وزیر ساخت ۔" (منتخب اللباب جلد دوم، صفحہ ۲۵۶)

دوسری جگہ (جلد دوم صفحہ ۱۳۱ میں) وہ خلیفہ سلطان کے خاندان کو "سلاطین زادہائے مازندران" بتاتا ہے، نہ کہ "سلاطین صفویہ کے خاندان کا رکن رکین" چنانچہ سید مظفر کے سلسلے میں جو خلیفہ سلطان کے خاندان میں سے تھا، لکھا ہے :۔

"سید مظفر کہ از سلسلہ خلیفہ سلطان از سلاطین زادہائے مازندران .... گفتہ می شد"

ایک اور جگہ وہ مرزا محمد ہاشم کی آمد کے سلسلے میں خلیفہ سلطان کے حسب ونسب کو بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے :

"مرزا محمد ہاشم نام کہ بہ واسطہ نواسۂ شاہ عباس ایران وبہ دو واسطہ نبیرہ خلیفہ سلطان پادشاہ زادۂ مازندران می شد، بعد ؛ کہ مازندران بتصرف شاہ عباس ثانی درآمد، وزارت ایران بخلیفہ سلطان سپردہ صبیۂ خود را بہ دو دادہ بود"

(منتخب اللباب جلد دوم ص ۶۶۳)

نیز خلیفہ سلطان اس وزیر خوش تدبیر کا نام نہیں تھا اور نہ "وزیر دانشور عراق" ہی نام تھا، نام اس کا جو بھی رہا ہو "خلیفہ سلطان" اس کا لقب تھا، عبد الحمید لاہوری نے اس بات کو صاف کر دیا ہے :

"خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ کہ لقب وزیر فرمانروائے ایران است" - (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۶۵۹)

اسی طرح "وزیر دانشور عراق" اس کی صفت اور ایک تعریفی و توصیفی کلمہ ہے -

ب - "وزیر دانشور عراق" میں مذکور "عراق" سے آج کل کا عراق مراد نہیں ہے جو قدیم مسوپوٹامیا کے مترادف ہے، بلکہ قرون وسطیٰ کے "عراق عجم" سے مراد ہے، جیسا کہ

Marfat.com

مذکورۃ الصدر تفصیل سے واضح ہے کہ یہ سفارت اصفہان میں مقیم تھی۔ یہیں خلیفہ سلطان وزیر دانشور "عراق" سے سفارت خانہ کے عملہ کا مناظرہ ہوا تھا، اور اصفہان قرونِ وسطیٰ کے "عراق عجم" کا صدر مقام تھا، اس لیے "ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہونے" کا کوئی محل نہیں ہے۔ ایران اور عراق (عجم) ایک ہی تھے۔

اسی طرح خافی خاں کی تصریحات سے بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ خلیفہ سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد" نہیں ہوا، بلکہ مازندران سے ترکِ سکونت کر کے اصفہان چلا آیا تھا، جو پایۂ تخت مملکت تھا، اور مازندران بھی ایران ہی کا ایک صوبہ تھا (اور ہے) ج (شوقؔ) کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وہ (خلیفہ سلطان) "پھر ہندوستان چلا آیا"۔ اسکے ہندوستان آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، البتہ اسکے خاندان کے دوسرے افراد بالخصوص اس کے پوتے ضرور آئے۔

ان خاندان والوں میں سب سے پہلے ہندوستان میں آنے والا اس کا بھائی مرزا قوام الدین تھا، اور اس کے ایران چھوڑنے کی وجہ برادرانہ ناچاقی تھی، جب بھائی سے نہیں بنی جو اب عہدۂ وزارت پر فائز اور حکومت کے سیاہ و سفید پر متصرف تھا تو اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ہندوستان چلا آئے، جہاں مغل دربار علما و فضلا کے ساتھ شرفا و نجبا کو بھی خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھا، چنانچہ خافی خاں نے لکھا ہے :-

"مرزا قوام الدین کہ از برادران خلیفہ سلطان و از سلسلہ بادشاہ زادہائے مازندران بود .... چوں میاں برادران موافقت نشد، مرزا قوام الدین رو بہندوستان آوردہ شرف اندوز ملازمت گردید۔"

یہاں آنے کے بعد وہ دیگر اسباب امارت کے ساتھ چار ہزاری دو ہزار سوار کے

Marfat.com

منصب سے نوازا گیا، پھر اس پر ہزاری ہزار سوار کا اضافہ ہوا، اور پہلے کشمیر کا پھر لاہور کا صوبہ دار مقرر ہوا، مگر لاہور میں یہاں کے قاضی سے جھگڑا ہو گیا، اس جھگڑے میں قاضی مارا گیا، اس کی پاداش میں قوام الدین معزول ہوا۔

خلیفہ سلطان کے عزیزوں میں دوسرا شخص سید مظفر تھا، جو قطب شاہی دربار (بیجاپور) میں چلا آیا تھا، وہ پہلے ابوالحسن تاناشاہ کے سرگرم حامیوں میں تھا، اور اس کی اور اس کے نوکروں کی مدد سے میر احمد کے عزائم کے علی الرغم قطب شاہی تخت پر متمکن ہوا۔ خافی خاں لکھتا ہے:

"میر احمد از روئے تبحر با مرائے خصوصی بسید مظفر کہ از سلسلۂ خلیفہ سلطان گفتہ می شد ...... آخر از اعانت سید مظفر و موسیٰ خاں محلدار وسعی و تردد اوتانا گیا کہ ہر دو برادر نوکر و پیشکاران معتمد سید مظفر بودند ..... میر احمد را مغلوب و بے اختیار و منزوی ساختہ ابوالحسن را سلطنت برداشتند"

(منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۳۱۱)

اس کے صلے میں تاناشاہ نے اسے اپنا وزیر بنا لیا، مگر بعد میں یہ خلوص و وداد نفرت و عداوت کی شکل میں بدل گیا اور تاناشاہ نے کسی نہ کسی طرح اس کو عہدۂ وزارت سے معزول کر دیا۔

تیسرا شخص خلیفہ سلطان کا پوتا اور شاہ عباس ثانی کا پرنواسہ تھا، اس کا نام میر علی نقی تھا، وہ عالمگیر اورنگزیب کے عہد ۱۱۰۹ھ میں ایران سے ہندوستان میں وارد ہوا، پہلے بندر گاہ سورت میں آیا، بادشاہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ کمال عزت و تکریم کے ساتھ اسے پایۂ تخت میں بھیجا جائے، چنانچہ خافی خاں ۴۲ جلوس کے حالات میں

لکھا ہے :-

"از سوانح بندر سورت بعرض رسید کہ میر علی نقی از بنا بر خلیفہ سلطان کہ با پادشاہ ایران نیز رشتہ قرابت قریبہ دارد، بامید بندگی درگاہ آسمان جاہ از ایران رسید حکم شد دو ہزار روپیہ از خزانہ بندر سورت تنخواہ نمایند و مہماندار از حضور تعین فرمودند"
(منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۴۵۶)

چوتھا شخص مرزا محمد ہاشم تھا جو میر علی نقی مذکور الصدر کا چچیرا جائی تھا، وہ ۱۱۲۱ھ میں عہد بہادر شاہ اول وارد ہندوستان ہوا۔ اور میر علی نقی ہی کی طرح آکر بندرگاہ سورت میں اترا۔ اس کے ساتھ ایک اور ایرانی امیر میر محمد صالح بھی تھا، جو شاہزادہ رفیع الشان کا نانی کی طرف سے رشتہ دار تھا، بادشاہ کو جب اطلاع ملی تو حکم دیا کہ گجرات کا صوبیدار اسے بھی اسی عزت و تکریم کے ساتھ دارالسلطنت روانہ کرے جس طرح عہد عالمگیری میں مرزا قوام الدین کو بھیجا گیا تھا۔ خافی خاں لکھتا ہے :-

"واز سوانح بندر سورت بعرض رسید کہ مرزا محمد ہاشم نام کہ بہ واسطہ نواسہ شاہ عباس ایران و بدو واسطہ نبیرہ خلیفہ سلطان ...... می شد ...... و محمد صالح نام عموی مومن خان نجم ثانی کہ با پادشاہزادہ رفیع الشان قرابت جدہ مادری دارد از ایران رسیدہ اند، حکم شد کہ دو گرز بردار و مہماندار برائے آوردن ہر دو با تنخواہ ...... بر خزانہ بندر سورت روانہ نمایند۔ و سوائے آں بنام ..... صوبہ دار احمد آباد فرمان صادر شد کہ بعد رسیدن مرزا محمد ہاشم باحمد آباد سرانجام اکیاج او بدستورے کہ محمد امین صوبہ دار احمد آباد در عہد خلد مکان برائے قوام الدین خان کہ بنی عم مرزا محمد ہاشم می شد ...... سرانجام نمودہ روانہ حضور ساختہ بود، نماید۔"
(منتخب اللباب جلد دوم ص ۶۶۳)

Marfat.com

مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"شاہجہانی سفرا جب عراق گئے تو خلیفہ سلطان سے بھی ملے، ان شاہجہانی سفراء کو بھی اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا۔" (دیکھئے محلات نظریہ ہے نمبر ۱۲)

مگر سفیر صرف ایک تھا یعنی "جان نثار خاں"۔ باقی لوگ بالخصوص وہ جو خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کر ملے" اور جنھیں "اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا"۔ سفارت خانہ کے عملہ میں ملازم تھے: ایک صاحب محمد فاروق "مشرف" (سپرنٹنڈنٹ) تھے، اور دوسرے صاحب محب علی "واقعہ نویس" (گویا پریس اتاچی)

مقالہ نگار نے لکھا ہے:۔

"ان شاہجہانی سفراء کو بھی اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا، اور اس کو قائم رکھنا گویا ہندوستان اور سلطنت ہند کی وہ عزت سمجھتے تھے، وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے..... شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے۔ جان نثار خاں نے شاہجہاں کو اطلاع کی۔"

(دیکھئے محلات نظریہ ہے نمبر ۱۳ و ۱۵)

مگر فاضل مقالہ نگار کی یہ قیاس آرائی محل نظر ہے کیونکہ اس ادعائے ہمہ دانی کا سلطنت ہند کی عزت و وقار سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ محض سفارت خانہ کے عملے کی بوالفضولی تھی سفارت صرف کشیدہ تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے بھیجی گئی تھی، نہ کہ خواہ مخواہ ہندوستانی علم و فضل کی برتری کا جھنڈا گاڑنے کے لیے۔

البتہ جب ان بوالفضولوں کو اس مناظرہ میں منہ کی کھانا پڑی تو پھر ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا، چنانچہ اس مکتوب کا جو دوسرا نسخہ

Marfat.com

"باغستان" میں منقول ہے، اس میں لکھا ہے کہ مناظرہ ہوا اور اس میں ہندوستانی سفارت خانہ کے علما کو بری طرح شکست ہوئی:-

"خلیفۂ سلطان ...... از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس .... پس از دعوائے ایشاں بفضل و کمال بر سیہ کہ امام غزالی ...... تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ ابو علی سینا نمودہ، وجہے تاویل کلام حکما کردہ اند ایں مراتب را تقریر باید کرد۔ مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند و از مسلک معقولیت دور افتادند۔"

اس کے بعد پرچہ نویس نے پوری تفصیل بادشاہ سلامت کی خدمت میں روانہ کی جس کے بارے میں وزیر اعظم نے اشارہ کیا ہے:-

"حسب الحکم اشرف می نویسد کہ چوں از افراد وقائع ایران بمسامع مجامع رسید ...."

ظاہر ہے اس خبر وحشت اثر سے بادشاہ کا مغموم ہونا فطری تھا اور اسی لیے اسکے استمزاج کے بعد علامی سعد اللہ خان نے یہ خط لکھا، اور علامہ سیالکوٹی سے استدعا کی:

"لہذا کمترین مریداں حکم شد کہ آں فضائل و کمالات دستگاہ سطرے چند برنگارد و برگزارد کہ آں افادت و افاضت مرتبہ را در یں مسائل مختصرے جامع و موجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکما و تاویلات علما ...... باشد ...... نوشتہ در حضرت خلافت در عرض دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ بایران فرستادہ شود۔"

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے:-

"خدا جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی۔ چنانچہ اسی کے پس و پیش زمانہ میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام سے لکھا، سلطان محمد خاں روم نے .... اس پر محاکمہ لکھوایا ہے۔"

(دیکھئے مجلات نظریہ میں سے نمبر ۶)

اس ارشاد کے آخری حصے پر تبصرہ تو پچھلی قسط میں آچکا ہے، رہا پہلا حصہ تو ابتداء میں شاہجہاں کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر جب سفارت خانہ کے ان بوالفضول مدعیان علم و فضل کی اپنے ہاتھوں لائی ہوئی بوا خیزی سے ہندوستان کا علمی وقار خاک میں ملنے لگا تو پھر ایک بیدار مغز حکمراں کی حیثیت سے شاہجہاں کو اس کی بحالی کی ضرورت کا احساس ہوا، اسی غرض سے یہ رسالہ لکھوایا گیا، چنانچہ علامی سعد اللہ خاں کے مکتوب کے آخری الفاظ اس خیال کے موید ہیں:۔

"و آں چناں باید بود کہ قابل فرستادن و لائق اضافت بآں فضائل دستگاہ بود
در روزگار از آں آثار گویند و در تاریخ اعمال نوشتہ آید"

اور یہ واقعہ ہے کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ نے بادشاہ کی اس توقع کو حرفاً حرفاً پورا کیا۔ ان تاثرات کی تفصیل تو نہیں ملتی جو ایران کے باکمالوں پر اس "درہ ثمینہ" کے مطالعہ سے پیدا ہوئے اور نہ اس انعام و اکرام کی تفصیل کا پتہ چلتا ہے جو اس رسالہ کی ترتیب و تحریر کے صلے میں بادشاہ کی جانب سے علامہ سیالکوٹیؒ کو عطا کیا گیا، لیکن علامی سعد اللہ خاں کی یہ آرزو یقیناً پوری ہوئی: زمانہ میں اسکے نشانات آجتک موجود ہیں اور تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں آج بھی اس کا حوالہ دیا جاتا ہے،

اس طرح ہندوستان کی کلامی عبقریت کا یہ شاہکار ظہور میں آیا جس کے دیباچہ میں فاضل سیالکوٹیؒ نے لکھا ہے کہ میں نے ان "قواعد عالیہ اور فرائد غالیہ" کو اہل نظر کے مطالعہ کیلئے بادشاہ شاہجہاں کے حکم سے تصنیف کیا ہے:۔

"یقول العبد المسکین عبدالحکیم ابن شمس الدین: ہذہ قواعد عالیة و فرائد غالیة نظمتها لقلوب واعیة
و آذان واعیة بامر الملک الہمام ..... ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب القران الثانی"

مگر ان "قواعد عالیہ و فرائد غالیہ" کا تفصیلی تعارف ایک مستقل بحث چاہتا ہے اور ایک مستقل پیش کش کا مقتضی ہے۔

Marfat.com

Ghauri Researches : Rational Sciences in Islam - 1

Rational Sciences in Medieval India

By
Shabbir Ahmad Khan Ghauri
(Aligarh)

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Marfat.com

اسلامی ہند میں علوم عقلیہ

از

شبیر احمد خاں غوری
علیگڑھ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Marfat.com